جلد ۲۵ اکتوبر ۴۵ء نمبر ۴

اُردُو

انجمنِ ترقیِ اُردُو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر:— عبدُالحق

شائع کردہ
انجمنِ ترقیِ اُردُو (ہند) دہلی

اُردو

- یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوا کرتا ہے
- یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے۔ حجم آج کل تقریباً سوا سو صفحات، جب کہ قوانین کنٹرول کے سبب کاغذ نیا تلا ملتا ہے۔
- قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے۔ نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔
- مضامین وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، ۱۰۱ دریا گنج۔ دہلی سے خط و کتابت کرنی چاہیے اور رسالے کی خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کو لکھنا چاہیے۔

جلد ۲۵ اکتوبر سنہ ۴۵ء نمبر ۱۰۰

اُردو

انجمنِ ترقّیِ اُردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر:۔ عبدالحق

شائع کردہ
انجمنِ ترقّیِ اُردو (ہند) دہلی

اُردُو

جلد ۲۵ | اکتوبر سنہ ۴۵ء | نمبر ۴

فہرستِ مضامین

سیّد اخلاق دہلوی نے جید پریس. بَلّی ماراں دہلی میں چھپوا کر
دفتر انجمنِ ترقّیِ اُردو (ہند) دہلی سے شائع کیا

انشا کے کچھ نئے حالات اور غیر مطبوعہ کلام

(جناب عبدالباری صاحب آسی لکھنوی)

اوائلِ ۱۹۴۳ء میں اتفاق سے مجھے کلیاتِ انشا کے بالاستیعاب دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اس وقت کئی نسخے بھی جمع ہوگئے جن کے دیکھنے سے پتا چلا کہ انشا کا بعض حصۂ کلام چھپنے سے باقی رہ گیا اور اس میں اس قسم کی ضروری چیزیں بھی ہیں جن کو ضرور چھپنا چاہیے تھا۔ بڑی کاوش اور محنت سے میں نے اُس کو جمع کیا اسی دوران میں مرزا فرحت بیگ صاحب کی ایک کتاب "انشا" بھی ایک کتب فروش کے یہاں دیکھی۔ اور اس اشتیاق میں کہ انشا کے سوانح حیات کے متعلق اس میں جدید تحقیقات سے کچھ اضافہ کیا ہوگا فوراً قیمت دے کر خرید لی۔ مگر کیا کہوں کتنی مایوسی ہوئی اُس وقت جب یہ معلوم ہوا کہ مرزا صاحب نے آزاد مرحوم کے بیان سے ایک قدم بھی باہر نہیں رکھا۔ اور پھر لطف یہ کہ "تذکرۂ گُل رعنا" سے مدد لے کر ساتھ ہی ساتھ آزاد کے بیان پر اعتراضات بھی کرتے گئے ہیں۔ بہرحال اس کتاب کے دیکھنے سے مجھے اتنا فائدہ ضرور پہنچ گیا کہ پہلے یہ ارادہ تھا کہ انشا کا غیر مطبوعہ کلام ہی "اردو" میں بھیج کر شائع کرا دیا جائے اور کچھ حالات نہ لکھے جائیں۔ اب اب یہ خیال ہوا کہ انشا کے بارے میں مولانا آزاد وغیرہ کی تحقیق کے ماورا جو اضافہ ہوا ہے اس کو بھی اسی میں شامل کر دیا جائے۔ اور یقین ہے کہ اس وقت تک یہ معلومات منظرِ عام پر نہیں آئی ہیں اور شاید یہ پہلی نظر ہوگی جو "آبِ حیات" کے راستے سے علاحدہ جا رہی ہے۔

انشا کے دادا کسی تذکرہ نویس نے یہ نہیں لکھا کہ انشا کے بزرگ نجفِ اشرف یا کشمیر سے آئے تو کب آئے؟ انشا کے بزرگوں ہی کو لیا جائے تو خود اِن کے والد پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ مگر اب یہ ابہام باقی نہیں ہے۔ بلکہ معلوم ہوگیا کہ انشا کے دادا شاہ نوراللہ ہندستان ہی میں پیدا ہوئے جو جعفری النسب تھے۔ یہ ایک تارک الدنیا بزرگ تھے، اور حصولِ دُنیا کے لیے سعی و کوشش کرنا اپنے آئین کے خلاف سمجھتے تھے۔ پھر جب تذکرۂ مخزن الغرائب[ا] کی روایت یہ ہے تو از روے درایت یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ان کے پردادا بھی کچھ نہ کچھ زمانے

[ا] تذکرۂ مخزن الغرائب شیخ احمد علی، جو اب تک غیر مطبوعہ ہے اور کتب خانۂ رام پور میں موجود ہے جس کا اقتباس دستور الفصاحت مرتبہ عرشی صاحب مہتمم کتب خانہ میں دیا گیا ہے۔

تک ہندستان میں رہے ہوں گے اور عجب نہیں ہو کہ ان کے دادا کی ہندستان ہی کے کسی خاندان میں شادی بھی ہوئی ہو۔

انشا کے والد اور ان کی خصوصیات

انشا کے والد بزرگ وار کا نام حکیم میر ماشاءاللہ خاں بتایا گیا ہو اور کہا گیا ہو کہ وہ شاعر تھے، مصدر ان کا تخلص تھا، دو ایک شعر بھی اُن کے نام سے تذکروں میں ملتے ہیں۔ مگر ان کے متعلق یہ بیان سراسر تشنہ اور ناکافی ہو۔ وہ بہت بڑے حاذق طبیبوں میں تھے۔ اور مخبرالدولہ ان کا خطاب تھا۔ علومِ متعارفہ میں اُن کو بہت کافی دست گاہ تھی۔ طالب علم، نہایت خوش مزاج تھے۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مگر بااین ہمہ نہایت دلیر، عالی حوصلہ، بلند ہمت اور مردِ میدان تھے۔ اور اتنے معرکوں میں شریک ہوے تھے کہ اِن کے تمام بدن پر زخموں کے نشان تھے۔ جاں دہی اور جاں ستانی ان کی نظروں میں ایک کھیل تھی۔

سخی اور باذل ایسے تھے کہ تذکرۂ مخزن الغرائب ' کا مصنف لکھتا ہو کہ حاتم کا نام اُن کے مقابلے پر نہیں لیا جا سکتا۔

عابد اور شب بیدار ایسے تھے کہ ہمیشہ زمین پر سوتے تھے اور بوریاے عبادت پر کروٹیں لیتے لیتے صبح کر دیتے تھے۔ قناعت اور استغنا کا یہ عالم تھا کہ مُرغ پلاؤ اور نانِ جویں کا اُن کی نگاہوں میں ایک درجہ تھا۔

وہ شاعر تھے اور شاعر بھی ایسے ویسے نہیں۔ ماہرِ فن اور کامل۔ سخن گوئی کے ساتھ سخن سنجی میں بھی یگانہ تھے۔ بدیہہ گوئی کا بڑا ذوق تھا۔ میر حسن نے لکھا ہو "ہر کہ پیش ایشان کلام خود بہ خواند درجواب آں بدیہہ گوئی را آمادہ می شوند"۔

مولانا آزاد نے لکھا ہو کہ میر ماشاءاللہ خاں دربارِ شاہی میں طبیب تھے اور زمرۂ امرا میں داخل تھے۔ ہم کو اس روایت کے صحیح ماننے میں یوں تامل ہو کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ نہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہو کہ وہ سلطنتِ چغتائیہ کے ضعف کی وجہ سے مرشدآباد گئے۔ اس لیے کہ سلطنت کا حقیقی ضعف غلام قادر کی دست درازی اور بنگال کے تینوں صوبوں کے نکلنے اور صوبہ الہ آباد کے منیرالدولہ کو تفویض کرنے اور اُن کے انتقال کے بعد شجاع الدولہ کے الہ آباد پر قابض ہونے سے شروع ہوا اور یہ سب باتیں بعد میں واقع ہوئیں۔ آزاد نے تو یہی کہ

تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے اپنی کسی خاص تحقیقات کی بنا پر ۹ رجادی الاول ۱۱۶۹ھ سے ۱۰ رشوال ۱۱۷۰ھ تک درباریوں میں منسلک ہونے کی تاریخ بھی مقرر کردی ہو۔ اس سے انکار نہیں کہ وہ مرشد آباد گئے۔ انشا وہیں پیدا ہوئے وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ صدرا تک عربی پڑھی اور پھر علم طب حاصل کیا۔ جس میں کامل مہارت بہم پہنچائی اور ماہر طبیب بن گئے۔ مگر اپنے پیشے کی طرف اُن کی توجہ نہ ہوئی بلکہ طبیعت کے جوش کا سیلاب شاعری کی طرف بہ نکلا اور اپنے والد کو کلام دکھانے لگے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے لکھا ہو کہ یہ میر سوز کے شاگرد ہوئے مگر تھوڑے ہی دِنوں بعد یہ اُستاد سے بگڑ بیٹھے یہ صحیح نہیں۔ اُن کو شاید میر حسن کے اس فقرے سے دھوکہ ہوا ہو جو انشا کے کلام کے بارے میں انھوں نے لکھا ہو کہ اُن کی شاعری میر سوز کے رنگ سے ملتی ہو اس کے سوا اور کوئی ثبوت نہیں۔ اسی طرح نساخ کا یہ فقرہ بھی قابلِ اعتبار نہیں کہ "ہر چند کچھ روز دن میاں مصحفی سے اصلاح لے کر منحرف ہوکے ہجو لکھی تھی۔ کیوں کہ انھوں نے صرف ایک سُنی سُنائی مشہور بات لکھ دی ہو۔ اور کچھ نہیں۔ اس خیال کی سب سے زبردست تردید اس بات سے ہوتی ہو کہ انشا تقریباً ۱۶ برس کی عمر تک مرشد آباد میں رہے اور وہاں سے جب یہ اپنے والد کے ساتھ واپس ہوئے تو ان کا دیوان تیار ہوچکا تھا۔ پھر وہاں مصحفی اور میر سوز کا کہاں وجود تھا۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ واقعہ کچھ بھی صحیح ہوتا تو مصحفی تو کم از کم اس کا کہیں اشارہ کرتے۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے چل کر ہم لکھیں گے۔ سردست یہ کہہ کر خاموش ہوتے ہیں کہ یہ صرف اپنے والد ہی کے شاگرد تھے اور کسی کو شاعری میں انھوں نے اپنا اُستاد اور مشیر نہیں بنایا۔

قصہ مختصر حکیم میر ماشاء اللہ خاں اپنی پوری شان و شوکت اور کافی امارت کے ساتھ مدتوں مرشد آباد میں رہے اور بہ قول صاحبِ مخزن الغرائب' نواب قاسم علی خاں کے زمانے میں ان کو مرشد آباد چھوڑنا پڑا جس کے بعد وہ نواب شجاع الدولہ کے یہاں آکر ملازم ہوئے اور انشا بھی اُن کے ساتھ تھے جن کا حال مفصل لکھا جائے گا۔ اس وقت صرف اتنا کہنا ہو کہ حکیم صاحب موصوف نواب شجاع الدولہ کی حین حیات تک فیض آباد میں دربار وزیر الممالک شجاع الدولہ میں منسلک رہے۔ اُس کے بعد نواب آصف الدولہ کا زمانہ آیا جو ابتدا میں نہایت ہی خراب رہا اور حکیم صاحب نے اس اشراف گردی کو کبھی پسند نہ کیا یہاں تک کہ وہ ترکِ فیض آباد کرکے پہلے امیر الامرا ذوالفقار خاں نجف خاں کے لشکر میں رہے اور پھر انھی کے ساتھ بندیل کھنڈ وغیرہ ہوتے ہوئے دہلی آئے اور یہاں مرزا محمد بیگ

ہمدانی کے ساتھ رہے اور سیکڑوں مردانہ اور دلیرانہ کام کیے۔ اور غالباً اُسی وقت شاہی دربار میں بہ حیثیت طبیب عزت و احترام کے ساتھ بسر کرتے رہے۔ مگر دہلی میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی سلطنت چراغِ سحری کا منظر پیش کر رہی تھی۔ نادر شاہ کی لوٹ احمد شاہ ابدالی کے حملوں کو دلی والے ابھی بھولے نہیں تھے کہ شاہ عالم کی رہی سہی وقعت کو غلام قادر نے برباد کر دیا۔ اور دلی کا بادشاہ واقعی ایک تکیے دار بن کے رہ گیا۔ حکیم صاحب کا ایسا دم گھبرایا کہ انھوں نے پھر دہلی کو خیرباد کہا اور فرخ آباد چلے گئے۔ ان کا تموّل مرشد آباد کی واپسی ہی پر دو بہ زوال ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی دہلی آئے تو اتنی سقیم حالت نہ تھی۔ مرشد آباد کی حالت کو دیکھتے ہوئے دلی میں فقیرانہ زندگی تھی اور دلی کے مقابلے میں فرخ آباد کے قیام کا زمانہ اور بھی قابلِ افسوس تھا، جہاں یہ نواب مظفر جنگ کی سرکار سے وابستہ تھے یہاں اُن کو شاید کوئی بڑی آمدنی نہ تھی۔ غرض کہ حکیم ماشاءاللہ خاں آخر وقت پھر مرشد آباد ہی میں رہے اور یہیں انتقال کیا اور یہیں مدفون ہوئے۔ اور بہ قول صاحبِ مخزن الغرائب یہیں اُن کا مزار ہے۔

سید انشا کے حالات

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انشا کی ولادت مرشد آباد میں ہوئی اور وہیں یہ سولہ برس کی عمر تک رہے۔ مگر ان کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ زیادہ تر ان کی ظرافت ان کی ہزالی اور مسخرگی ہی پر لکھا گیا ہے باقی خیریت۔ مگر جن لوگوں نے ان کو دیکھا ہم ان لوگوں کو شہادت میں پیش کرتے ہوئے ان کے عادات و اخلاق وغیرہ پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

وہ نہایت حسین اور خوب صورت تھے۔ میر حسن نے "از خوبانِ جہاں و از خوش فکرانِ زماں" لکھ کر ان کی خوب صورتی کو خوش گوئی پر مقدم کیا ہے۔ خود انشا نے بھی مرزا مظہر جان جاں کی ملاقات کو جاتے ہوئے الفاظ میں اپنی تصویر کھینچی ہے جو ان کے حُسنِ خداداد کے مناسب حال ہے۔ کہتے ہیں کہ "خط را نزاش دادہ و جامۂ ململ ڈھاکہ پوشیدہ و دستارِ شربتی باندھنو بر سر گزاشتم۔ و دیگر لباس ہم ازیں قبیل۔ و از سلاح کٹار بسیار خوبے بہ کمر زدہ بودم۔" اس کے علاوہ کسی اور نے بھی ان کا یہ شعر سن کر کہ ؎

گر نازنیں کے کہنے سے مانا بُرا ہو کچھ میری طرف کو دیکھیے میں نازنیں سہی

کہا تھا کہ دریں چہ شک

رنگ گورا، قد درمیانہ۔ اکثر صافہ باندھتے تھے اور شملے کو گلے میں لپیٹ لیتے تھے۔ یہ وضع یہ بانک پن اور جانی کا عالم۔ آخر کس کو اچھا نہ معلوم ہوتا ہوگا۔ میر علاء الدولہ نے اپنے "تذکرۃ الشعرا" (غیر مطبوعہ) میں لکھا ہے "جوان وجیہ بہ دل نزدیک تر است۔ با مولف تذکرہ فقیر اشرف علی خاں آشناست"۔

ظریف مزاج بھی ایسے کہ بہ قول شوق رامپوری مصنف و مولف "تذکرہ تکملۃ الشعرا" چار ابرو تک کا صفایا کراتے تھے اور آزاد فقیروں کی طرح باتیں کرتے تھے۔ مسوڑ اتنے کہ راہ چلتوں کو چھیڑتے۔ اگر وہ کچھ کہتا تو یہ اور چھیڑتے اور اُسے غصہ دلا دلا کر جی بھر کر گالیاں کھاتے چناں چہ مخزن الغرائب شیخ احمد علی کی یہ عبارت اس کی گواہ ہے:

"بندہ نیازے در خدمتش دارم۔ او نیز شفقت بہ حال من از روز ملاقات تا امروز مبذول می دارد۔ در عالم آشنا پرستی بے نظیر زمانہ و در شعر ہندی موجد طرز تازہ و یگانہ است۔ آدمی کہ در صحبت او دو دم باشد غم ہائے زمانہ فراموش می کند۔ نقل ہائے عجیب و قصہ ہائے غریب یاد دارد و از پیش طبیعت خود نیز می تراشد۔ لطیفہ ہائے او اگر شمار کردہ آید کتابے جداگانہ مرتب می تواں کرد۔ در بزم خود را کم تر از یک طفل نامرد حساب مے کند۔ برائے ہر کس نوائے برمی آرد اگر گاہے بہ خاطرش می گزرد با آدم راہ رو بیگانہ صورت ظرافت سر می دہد دریں صورت اگر طرف ثانی سکوت کرد خیر و اگر شروع دشنام نمود می خندد و او را بر سر غضب می آرد۔ با آدم کم مرتبہ ایں معاملہ دارد۔"

جب یہ حالت ظرافت اور شگفتہ مزاجی کی تھی تو پھر کیا امید کی جا سکتی ہے کہ ایسا آدمی دلیر اور شجاع بھی ہو۔ مگر نہیں وہ بڑے زبردست شہسوار تھے۔ تیراندازی اور شمشیرزنی کے ماہر تھے۔ کبھی کسی سے دبتے نہ تھے۔ اور ہفت ہزاری سے بھی اپنے خلاف مزاج بات نہیں سن سکتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب مرزا قاسم علی خاں خلف نواب سالار جنگ سے کسی شعر پر بگڑ گئے اور حضور عالی کے سامنے ذلیل کر کے چھوڑا۔ ایک بار جو نگر میں اسمٰعیل بیگ محمد بیگ ہمدانی کے بھتیجے سے ایسے بگڑے کہ کٹار کھینچ کر اس پر ٹوٹ پڑے اور جو کچھ منہ میں آیا کہہ ڈالا۔ حالاں کہ اسمٰعیل بیگ وہ شخص تھا کہ اُس وقت کے بڑے بڑے نامور دلاور اور مشہور لڑنے والے اس کے سامنے کان پکڑتے تھے۔ خدا نے خیر کی کہ اُس روز ان کی جان بچ گئی ورنہ معاملے نے اتنا طول کھینچا تھا کہ جان جانے میں کوئی کسر نہیں تھی۔

یہ سب کچھ تھا مگر زرا کینہ پرور اور دل میں بات رکھنے والے اور ابن الوقت نہ تھے۔ بوہ مراوت دل میں

بیٹھ جاتی وہ فطری اور خلقی ہوکر رہ جاتی تھی پھر ممکن نہ تھا کہ دل سے نکل جاتی۔ سید انشا نے اپنے پدر بزرگوار کی معیت میں جب مرشد آباد کو الوداع کہا تو اُسی دربار میں یہ بھی آئے جہاں کہ وہ وارد ہوئے تھے۔ یعنی یہ بھی نواب شجاع الدولہ کے مصاحب ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر سولہ برس کی تھی۔ علوم رسمیہ سے باخبر تھے اور آدابِ مصاحبت سے کماحقہٗ واقف تھے۔ اُس وقت اِن کا دیوان تمام ہوچکا تھا۔ چناں چہ تذکرہ مخزن الغرائب کی یہ عبارت اس کا ثبوت ہے۔ "چوں بہ شانزدہ سال رسید بہ حضور نواب وزیر الممالک شجاع الدولہ داخلِ جلسا شد۔ دراں وقت دیوانِ ہندی بطورِ خود و بہ طرز نوے بے استاد ردیف وار تمام نمودہ بود و پارہ از اشعارِ عربی و فارسی ہم برادراق ثبت داشت۔"

عام تذکرہ نویس اس بنا پر کہ اُن کے دیوان میں کئی زبانیں پائی جاتی ہیں، کہتے ہیں کہ وہ کئی زبانیں مثلاً عربی، افغانی، فارسی، اُردو، پنجابی، مارواڑی وغیرہ جانتے تھے۔ اور انھی زبانوں میں شعر بھی کہتے تھے۔ مگر میر ولی اللہ نے "تاریخ فرخ آباد" میں لکھا ہے کہ سعادت علی خاں کی مسند نشینیٔ وزارت کے وقت انشا نے چونتیس[۳۴] زبانوں میں قصیدہ کہا۔ جب شجاع الدولہ کا انتقال ہوا تو یہ اپنے والد کے ساتھ دہلی آئے۔ اور شاہ عالم کی مصاحبت میں بسر کرنے لگے۔ جب حکیم میر ماشاء اللہ خاں دربارِ دہلی کا رنگ بگڑتا دیکھ کر فرخ آباد چلے گئے تو غالباً سید انشا دہلی میں رہے اور صرف اپنے والد کی زیارت کے لیے دو چار مرتبہ فرخ آباد گئے۔

دہلی میں شعرا سے جو معرکے پیش آئے اور جو ہنگامے ہوئے اُن کا چوں کہ "آبِ حیات" وغیرہ میں ذکر آچکا ہے اس لیے ہم ان کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتے۔ ہاں یہ کہنا ہے کہ جب دلّی کی حالت بالکل خراب ہوگئی اور وہاں کے اکابر و شرفا جابجا منتشر ہوگئے تو یہ بھی لکھنؤ چلے آئے۔ اور یہاں آکر شہزادہ سلیمان شکوہ کے ہاں ندیموں اور مصاحبوں میں ملازم ہوگئے۔ مگر چند روز اُن کے یہاں رہ کر بہ وجہ اپنی نازک مزاجی کے اُن سے بھی خفا ہوگئے اور پھر میاں الماس علی خاں کے مصاحب ہوئے۔ اُس کے بعد سعادت علی خاں کی رفاقت میں آئے یہاں جو واقعات اور مناقشات مصحفی وغیرہ سے ہوئے اُن کا تھوڑے سے تغیّر کے ساتھ تذکروں میں ذکر آچکا ہے۔ لیکن "تذکرۂ معرکۂ خوش زیبا" (غیر مطبوعہ) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام ہنگامہ خود شاہ زادۂ سلیمان شکوہ کے اشارے سے اٹھا تھا۔ وہ زمانہ نواب آصف الدولہ کا تھا۔ جب یہ ہنگامہ ہوا تو نواب موصوف شکار کے لیے

گئے ہوئے تھے اسی لیے مصحفی نے اپنے شاگردوں کو منتقمانہ کارروائی سے روک دیا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب آصف الدولہ واپس لکھنؤ ہوئے اور ان کو اس ہنگامے کا علم ہوا تو انھوں نے انشا کو شہر بدر ہونے کا حکم دے دیا۔ چناں چہ حکیم مولوی عبدالحی صاحب نے اپنے 'تذکرۂ گلِ رعنا' میں اس واقعے کو یوں لکھا ہے اور انھوں نے یہ قصہ 'تذکرہ خازن الشعرا' میرزا جان الہ آبادی سے اقتباس کیا ہے جس کی عبارت یہ ہے "ہنگامے کہ فی مابین میر (انشا) و میاں مصحفی مناقشہ واقع شدہ و نوبت ہجو یک دیگر کشید۔ وزیر الممالک میر (انشا) را رخصت انصراف داد و ایشان بہ حیدرآباد رفتند۔ از اثنائے راہ عریضہ بہ خدمت جدِ امجد (شاہ اجمل) ارسال نمودند و دراں یک بیت ہم بود ؎ یونہی بے شغل ہمارا کوئی دل رہتا ہے : ایک قاتل اُسے ہر حال میں مل رہتا ہے حضرت بہ جوابش تحریر فرمودند ؎ خوش باش دلت چرا خراشد۔ انشاءاللہ خیر باشد۔ و چیزے از اعمال مجرب بہ حسب طلبِ میر نیز ارسال فرمودند۔ بعد عرصۂ قلیلے نواب وزیر میر را بہ لکھنؤ طلب فرمود۔ میر بہ لکھنؤ رسید و خط شکرگزاری بہ حضرت جدِ مرحوم نوشت۔ ہنگام جمع ایں ترجمہ آں خط باوجود تلاش بسیار بہ دست نیامد۔" یہ روایت کچھ زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ مگر چوں کہ ایک حد تک انشا کے حالات میں اضافہ کرنے والی ہے اس لیے لکھ دی گئی۔

سعادت علی کے ساتھ انشا کی زندگی جن رنگ رلیوں میں گزری اس کے لیے 'آبِ حیات' کا دیکھنا ضروری ہے۔ ہم کو صرف یہ کہنا ہے کہ اپنے جوان بیٹے کے انتقال کے ملال اور سعادت علی خاں کی سخت گیریوں کی وجہ سے انشا آخر میں دیوانے ہوگئے تھے۔ یہی 'آبِ حیات' کے مصنف کا خیال ہے مگر ہم کو اس کے اعادے کی ضرورت یوں ہوئی کہ مؤلفِ 'گلِ رعنا' نے ان کی دیوانگی کے قصے کو آزاد کا بنایا ہوا افسانہ سمجھا ہے اور 'حیاتِ دبیر' کے مؤلف مرزا اوج کا یہ فقرہ دیکھ کر کہ سید انشا نہ مجنوں ہوئے نہ مخبوط اُن کو پورا یقین ہوگیا ہے کہ وہ آخرِ عمر میں مجنوں نہیں ہوئے تھے۔ مگر ایسا نہیں ہے آزاد کی تحقیق صحیح ثابت ہوتی ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ احمد علی یکتا نے اپنی کتاب دستور الفصاحت میں انشا کے بیان میں لکھا ہے۔ "آخر آخر مجنوں شدہ چند سال گزشتہ بودند کہ بہ ہماں مرض درگزشت۔"

انشا کی عمر کے متعلق مطبوعہ تذکروں میں کوئی ذکر نہیں آیا۔ مگر احمد علی یکتا نے اس کو بھی صاف کردیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی عمر ساٹھ برس سے متجاوز تھی کہ دنیائے فانی کے تمام خرخشوں سے نجات پاگئے۔ سالِ وفات

۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ء تھا۔ بسنت سنگھ نشاط نے جو ان کی تاریخ وفات لکھی ہے وہ تعمیے کے طور پر ہے جس سے سنہ ہجری ۱۲۳۳ھ نکلتی ہے۔ بلوم ہارٹ اور صاحبِ "طبقات الشعرا" کو دھوکا ہوا ہے کہ انھوں نے تاریخِ وفات ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۵ء لکھ دی ہے۔

انشا کی عادت تھی کہ وہ ہر جگہ اپنی بات کو بالا رکھنا چاہتے تھے اور اپنے علم و کمال کے زعم میں کسی کو اپنا مدِ مقابل نہ جانتے تھے۔ اور اس بات کا اُن کی بہت سی چیزوں سے پتا چلتا ہے۔ مگر مولف "مخزن الغرائب" نے یہ لکھ کر مجھ کو سخت حیرت میں ڈال دیا ہے کہ وہ قتیل کو اپنے سے بہتر جانتے تھے اور اُن سے دبتے تھے۔ عاشقی نے "نشترِ عشق" میں ایک واقعہ بھی قتیل کے ذیل میں ایسا ہی نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "روزے سعادت یار خاں رنگین ہنگام معاودت از لکھنؤ برائے دیدن راقم تشریف آورد، و عند الاذکار مرزائے موصوف (قتیل) قسمیہ بیان نمود کہ نوبتے انشاء اللہ خاں مرحوم کہ از یارانِ مرزائے موصوف بود و باخود ہا مزاج و خوش طبعی ہم می شد و ردو سہ روز بہ غور و تامّل بسیار دو سہ فقرۂ نثرِ بے نقط تلاش نمودہ رقعہ بہ مرزا قتیل نوشت۔ صبح آں چوں باخود ہا ملاقات گردید آں مرحوم از راہ اختلاط بامرزا گفت کہ دیدی چہ قسم رقعہ نوشتم و چہ فقرہ ہائے معنی یاب بے نقط بہم رسانیدم۔ حالا مقدور تو نیست کہ در جواب آں دم زنی و بہ پاسخ آں بہ نگاری ایشاں فی الفور قلم برداشتند و تفسیرِ بے نقط سورہ ہائے قرآنی کہ بہ اں مغفور از بر بود و می خواند در عرصۂ یک نیم پاس بہ نہایت روانی و سلاست بہتر از عبارت سواطع الالہام بہ ضبطِ تحریر در آوردند۔" یہ روایت کتنی ہی معتبر اور راوی کیسا ہی ثقہ سہی۔ مگر مجھے کسی طرح اوّل تو یہی یقین نہیں آتا کہ انشا کسی چیز میں قتیل سے کم تھے۔ اور قتیل کی عربی ایسی تھی کہ وہ سواطع الالہام سے بھی اچھی عبارت لکھ لیتے تھے اور انشا منھ دیکھ کر رہ جاتے تھے۔ دوسرے دو رقعے ہیں جن میں انھوں نے قتیل کو وہ کھری کھری سُنائی ہیں جنھیں دیکھ کر یقین آجاتا ہے کہ قتیل کسی صورت میں انشا کے مدِ مقابل نہ تھے۔ میرے پاس "کلیاتِ انشا" کا ایک نسخہ ۱۲۴۰ھ یا ۱۲۴۸ھ کا لکھا ہوا موجود ہے جو لکھنؤ میں لکھا گیا۔ اور اس حساب سے وہ انشا کے انتقال سے سات برس یا زائد از زائد پندرہ برس بعد کا ہے۔ اور اس کو جس شخص نے خریدا ہے اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ عبارت پہلے صفحے پر موجود ہے کہ "ایں کتاب بہ قیمت دہ رُپے خریدا شد چرا کہ ہنوز رائج نیست" اُسی دیوان کے دوسرے ورق پر یہ واقعہ لکھا ہے جو انشا کے بیان پر مبنی ہے،

یک روز بعد نماز بہ تلاوتِ کلام مجید مشغول بودم۔ دراں روز مرزا قتیل ہم در خانۂ من مہمان بود چوں کہ تلاوت کردہ بودم لفظِ مَعَنَا (یعنی بہ فتح عین)، خواندم مرزا قتیل لفظِ معنا شنیدہ گفت کہ مَعْنَا (یعنی بہ سکونِ عین) باشد خوب باشد کہ در قاعدۂ عربی معناست۔ فوراً کبت گفتم۔ کبت

کہے جو کہ قتیل صحیح ہے وہ کہ وہ کھتری ہے اور گدھے کی ہے دُم
کہے وہ جو خدا مَعنا سو غلط نہ طریقِ رشاد کو کیجیے گُم
مَعَ ہو جو مضاف تو عین کو جزم اجی کیوں کر بھلا کہو مجھے تم
تو مثالیں غلط ہوں سب نہ یہ مَعَنَا مَعَ مِن مَعَنَا مَعَکُم

اسی طرح ہائے ہوز اور رہائے حُطّی کا جھگڑا بھی دیکھیے اور خیال فرمائیے کہ ذرا سی بات پر مرزا قتیل کو کتنا عاجز کیا ہے۔ یہ ایک منظوم خط ہے جو ہم کو اُسی قلمی کلیات سے دست یاب ہوا جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

اپنا مشفقا بندہ نوازا   اِذَا حَرَّرْتَنِی قولاً ثقیلا
وہ خط لکھا کہ جس کو پڑھتے ہی میرا   ہوا غصے کے مارے رنگ نیلا
کہ یعنی چست اور چالاک ہے تو   نظر آیا ولیکن سخت ڈھیلا
تجھے کہتی تھی دُنیا قاف سمنی   تو کیوں کر بن گیا مجنوں کا ٹیلا
وہ چھوٹا سنہ تھا تجھ کو یاد جس سے   بہت سے اژدہوں کو تو نے کیلا
مقابل وصل کے تھا ہجر مشہور   جھٹ اس کو علم کے چاکو سے چھیلا
بہت سی اور ڈھب کی پخت و پز کا   دیا تھا جھونک چولھے میں پتیلا
بلا تحقیق لفظِ ہجر ہیں کل   لیا کیوں حائے حُطّی کا وسیلا
جواب اس شبہے کا تو مجھ سے سُن لے   نہ کالا بن نہ نیلا ہو نہ پیلا
وہ ہجراً ہے جو مجورا کے ہم راہ   سو ہے حُطّی ہی ہاں مرزا قتیلا

وہ مجبوراً ہی ہوز سے حلیلا ولے جو ان قومی کے ہی آخر
یقولون آیہ ہی تیرا دلیلا نہ چٹکی دل میں لے واصبر علیٰ ما
ہی بالفتح وہاں ھجرا جمیلا ذرا تو سورۂ مزمل میں تو دیکھ
مجھے کیوں کر کرے گا تو ذلیلا یہی تو فتح کا باعث ہوا ہی
یہی آیت و مھلھم قلیلا بھلا آ تو سہی میں بھی پڑھوں گا
تو بسم اللہ حاضر کر ابھی لا جواب اس کا جو کچھ خاطر میں گزرے
اُٹھا دیوانِ حافظ تو ابھی لا پھر او شاخِ نبات اٹکس سے دیکھ
پڑھے گا یہاں ہر اک گل سے رنگیلا شب وصل است وطی شد نامۂ ہجر
یہی مصراع ہی اس کا سجیلا سلامٌ ھیَ حتّیٰ مطلع الفجر
تر کیوں اشک سے دامن ہی گیلا ہو الغالب ہی انشاء اللہ انشا

انشا کو ہمیشہ جدت طرازی کا ذوق رہا۔ یہی سبب ہی کہ ان کا دیوان آج ہم کو دوسرے شعرا کے دیوانوں سے بالکل علاحدہ نظر آتا ہی۔ پھر جس طرح وہ اپنی روش اور اپنے طرزِ کلام میں اختراع اور ایجاد سے کام لیا کرتے تھے اسی طرح نئی نئی بحروں کے نکالنے کی اُن کو ایک دُھن تھی۔ اس کی پروا نہ کرتے تھے کہ وہ قابلِ قبول ہی یا نہیں، دُنیا اس کو پسند کرسکتی ہی یا نہیں۔ اُنھیں اپنے کام سے کام تھا۔ چناں چہ ایک بحر کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

مطلع ایجادِ تازہ کہ ہر مصرع سی وشش فعلن دارد۔ در بحرِ طویل ایں است ؎

دِل و دیدہ میں آیا مقام کیا کہ مرا ہی جہاں میں نام کیا
یہ اُنھوں نے تو زور ہی کام کیا مجھے عشق میں شہرۂ عام کیا
مری روح و جسد میں خرام کیا مجھے لائقِ نطق کلام کیا
مجھے قیدیٔ دانہ و دام کیا مجھے روحِ قدس نے سلام کیا
مجھے فوجِ ملک نے امام کیا

جو شرابِ طہور کی جلوہ گری | خُمِ لمعۂ نورِ ظہور میں تھی
کہ قصورِ سرور میں حور نے لی | ہوئی جس سے کہ کشتِ امید ہری
وہی ساقیٔ بزمِ حضور نے دی | بہ علیِ ولیِ وصیِ نبی
مجھے مبنعِ گردشِ جام کیا | مجھے بانیٔ شربِ مدام کیا
مجھے انشا اب ان نے غلام کیا

اسی طرح ایک اور بحر ایجاد کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ این بحریست مُسمّٰی بہ سکران کثیرۃ الارکان کہ
بہ پنجاہ و پنج فعلن دارد

بہ شکوہِ معقرِ عرشِ بریں | بہ لوامعِ قدسِ دمکان و مکیں
بہ تقرّبِ قدرتِ روحِ امیں | بہ ترفّعِ پایۂ سدرہ نشیں
بہ خشوع و خضوعِ گروہِ یقیں | بہ مراتبِ ہمۂ گوشہ گزیں
بہ بروج و کواکب و ماہِ مبیں | بہ صوامعِ زینتِ اہلِ زمیں
بہ تلمعِ صورتِ مہر جبیں | بہ تلالؤ خاتم و تاج و نگیں
بہ محمدِ مالکِ شرعِ متیں | بہ علی ولی ہژبر غریں
بہ طفیلِ شفیعۂ روزِ جزا
بہ خصالِ حمیدۂ ذاتِ حسن | بہ حسینِ شہیدِ غریبِ وطن
بہ رؤسِ فتادہ جدا ز بدن | بہ جروحِ شگفتہ بہ رنگِ چمن
بہ مُفوضِ خاک بدونِ کفن | بہ عبادتِ عابدِ پا بہ رسن
بہ تبحّرِ باقرِ سر و علن | بہ محامدِ صادقِ اہلِ سخن
بہ مودّتِ کاظمِ رنج و محن | بہ کراماتِ ثامنِ ضامنِ من
بہ تقی و نقی و سمی و حسن | بہ محمد مہدیٔ فخرِ زمن
ہمہ عقدۂ بندۂ خود بہ کشا

انشا کی چند غیر مطبوعہ غزلیں

اگر نہ مجھ سے تو آکر لپٹ گیا ہوتا — تو رات تجھ سے مزاجی ہی پھٹ گیا ہوتا
کہے ہے خندۂ قل قل تبسمِ گل دیکھ — ہنسی کے مارے مرا دم اُلٹ گیا ہوتا
ہزار حیف بلا چاندنی میں ہم سے دو ماہ — وگرنہ رات کو سب ڈول پٹ گیا ہوتا
دلِ رمیدہ لگاوٹ نے تیری قہر کیا — جفائے یار سے تو کاش ہٹ گیا ہوتا

بہ شدت آپ سے انشا خفا ہوا تھا رات
تم اُس کو گر نہ مناتے چپٹ گیا ہوتا

ہو یہ گھر کھوج مٹے چاہ نصیبِ اعدا — کرے اس دُکھڑے کو اللہ نصیبِ اعدا
ایک دل خستہ یہ رستے میں کھڑا کہتا تھا — مرضِ عشق نہ ہو آہ نصیبِ اعدا
حیف تم چاند سا مکھڑا نہ دکھاؤ تم کو — اور یوں ہو یہ شبِ ماہ نصیبِ اعدا
میں کہا حق کرے اب تم بھی کسی کو چاہو — لگے فرمانے کہ اک واہ نصیبِ اعدا
دال فے عین ہو رے واو زبر رو ہو ارے — سخت یہ درد ہے بیاں کاہ نصیبِ اعدا
خاک منھ میں ترے اس منھ کو لگے آگ مجھے — نہ بھنکاوے یہ خدا راہ نصیبِ اعدا
کوستا ہے مجھے چل دور یہ بدفال نہ بول — میرے بیری مرے بدخواہ نصیبِ اعدا
خوبی خلطے کی ہے دیوانہ نہ ہو منھ کو سنبھال — میں کروں غیر کی پرواہ نصیبِ اعدا

عشق صاحب کو مبارک رہے انشاءاللہ
عشق اور بندۂ درگاہ نصیبِ اعدا

اکڑکے پنجوں کے بل یہ چلنا نہ کشتہ کیوں کر ہوں اس ادا کا — سجا سجایا کسا کسایا یہ دھج تو دیکھو غضب خدا کا
بُروں ہے وہم و قیاس سے بھی کروں جو تعریف اس صنم کی — جوانِ رعنا بہ حُسن و خوبی پری کا عالم غرض گدا کا
نگہ یہ ظلم و کرشمہ آفت قیامت اُس پر یہ قامت اُس کی — ملاحت ایسی بلا کہ توبہ یہ عالم اپنے ہے دلربا کا
بہ رنگِ گُل کے بھلا میں کیوں کر کروں نہ جیبِ شکیب ٹکڑے — کنار میں اس کو تنگ کھینچے ہوا یہ مقدور اب ہوا کا

گھٹا یہ کالی گلوں کی یہ بوُخروشِ رعد اور برق ایسا
پلا نہ بھر بھر کے جام ساقی سمجھ نہ اندازہ ٹک ہوا کا

شب انکھڑیوں کا تری تصوّر خیال میں مجھ کو اس قدر تھا
کہ بوُے نرگس سے پُر ہے اب تک کنارِ دامن مری دُعا کا

جو شخص طالب حسینؑ کا ہو تصدّق اُس کے نہ کس طرح ہوں
غلام و فدوی ہوں جی سے انشا شہید میدانِ کربلا کا

بُتِ کافرِ مسیحا دم فرنگی ملّت اور ترسا
نصارا گر تو مجھ مومن کو یا مجھ پاس بے ترس آ

نہ طفلِ اشک کے منھ چڑھ تجھے کہتا ہوں ای ناصح
کہ ہے یہ شوخ ناداں نا قیامت فہم ابتر سا

شعاعِ آفتابِ روزِ محشر سے سکھایں گے
اگر دامانِ رندانِ سبوکش کچھ ہوا ترسا

لگا تیرِ نگہ سینے میں ایسا ایک ای قاتل
کہ وہ نے دِل ہمارا نیم بسمل ہو کبوتر سا

تری خاطر حرم سے آ ہو راکب کلیسا کا
قسم عیسیٰ ابنِ مریم کی تجھے انشا کو مت ترسا

جونہیں کعبے سے فقیروں نے اٹھایا بسترا
جھٹ درِ بیت الصنم پر جا بچھایا بسترا

کیا تعیّن ہم کو منزل کا کہ ہیں آزاد لوگ
دن جہاں آخر ہوا بس وہاں بچھایا بسترا

منکا ٹھنکا سیلی تاگا ہو گیا بھسمنت سب
آہ کی دھونی سے سب اپنا جلایا بسترا

بہرِ تعویذ اُس پری رو کو لگا لایا فقیر
یعنی اس تقریب سے اپنا دکھایا بسترا

بال گوپالوں سے اکثر اپنے کبھی ای جبرئیل
سدرہ کے سایے تلے جا کر بچھایا بسترا

مرشد اللہ سب مراقب ہو یہ روئے کل کہ صبح
بالکوں نے دھوپ میں اُن کا سکھایا بسترا

دشت میں اپنے جو آیا قیس وحشت نے کہا
چل بے بے وحدت پرے کیوں یہاں تو لایا بسترا

اُن قلندر مشربوں کا وقت خوش انشا جنھیں
خاکِ صحرائے قناعت پر خوش آیا بسترا

دل کے نالوں سے جگر دُکھنے لگا
یاں تلک روئے کہ سر دُکھنے لگا

دوُر تھی ازبس کہ راہِ انتظار
تھک کے بہ پائے نظر دُکھنے لگا

روتے روتے چشم کا ہر گوشہ یاں | تجھ بن ای نورِ بصر دُکھنے لگا
درد یہ ہی ہاتھ کر رکھا اُدھر | وھاں سے تب سرکا اِدھر دُکھنے لگا

مت کراہ انشا نہ کر افشائے راز
دل کو دُکھنے دے اگر دُکھنے لگا

اس کے بعد ہم انشا کی مثنوی مرغ نامہ لکھتے ہیں جس کے صِرف اوّل کے ۴۲ شعر مطبوعہ نول کشور کے نسخے میں پائے جاتے ہیں باقی مثنوی ندارد ہی۔ حالاں کہ انشا کی تمام مثنویوں میں سب سے زیادہ یہی کارآمد ہی۔ کیوں کہ یہ ایک فن کے متعلق ہی اور خاص کر اُس زمانے میں جب کہ لکھنؤ کی گلی گلی اور کوچہ کوچہ مرغ بازی کی جولاں گاہ بنا ہوا تھا۔ اور شریف سے شریف اور وضیع سے وضیع لوگ بھی مُرغ دربغل نظر آتے تھے جس کی بے چارے میر صاحب تاب نہ لاسکے اور مجبوراً ایک مثنوی ہجو میں کہہ ڈالی۔

انشا کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ اُن کو خود بھی مُرغ بازی کا بڑا شوق تھا۔ لیکن انھوں نے یہ مثنوی مُرغ بازی کے فن پر مرزا قاسم علی برادر وزیر الممالک کے حکم اور فرمایش سے لکھی۔ ان کے ہاں ایک شخص خلیفہ بابو تھے وہ بتاتے گئے اور انشا نظم کرتے گئے۔ بابو صاحب اس فن کے ماہرِ کامل تھے۔ لہٰذا یہ قواعد نہایت ہی مستند ہیں۔ چوں کہ شاہ زادہ سلیمان شکوہ اور خود نواب آصف الدولہ کو بھی مُرغ بازی کا شوق تھا اس لیے بہ مصداق الناس علیٰ دینِ ملوکھم تمام لوگ اس میں مبتلا تھے۔ اور چوں کہ ہزاروں روپے کی بازیاں بدی جاتی تھیں اس واسطے اُس میں بے ایمانی، جھگڑے فساد ہوتے اور قتل تک نوبت پہنچتی تھی اس لیے ضرور تھا کہ اس کے قواعد مقرر ہوں۔ چناں چہ سب سے پہلے انشا نے اس پر قلم اُٹھایا اور یہ مثنوی لکھی:

(مثنوی مرغ نامہ انشا)

حمد ہی فرض اس کی وقتِ سحر | جس نے کاٹے ہیں مرغِ روح کے پر
کردیا ہی اُسے جسد میں بند | کہ وہ یک چند وھاں رہے خورسند
مُرغ زرّینِ آفتابِ فلک | نسرِ طائر سے لے کے تا بہ ملک

اور سکّانِ عالمِ لاہوت　　　　یاد میں جس کی ہیں سبھی مبہوت
کُنہ میں جس کی ذہن کا طاؤس　　　　خلق کرتا ہے طائرِ افسوس
کیا کہوں وہ بڑی کھلائی ہے　　　　اُس سے غافل ہے [illegible] تو
کرکے بن مُرغ روح کا ڈھانچا　　　　جس نے ڈھانپا سپہر [illegible]
حکم سے جس کے اس زمانے میں　　　　یعنی دُنیا کے مُرغ [illegible]
رات دن ماکیانِ اوجِ سپہر　　　　روز دیتی ہیں ایک بیضۂ مہر
نیند کو چھوڑ صبح ہے نزدیک　　　　بانگ ہوتی ہے جوں صیاح الدیک
دیکھ تو کیا سرور کا ہے وقت　　　　طرفہ نور وظہور کا ہے وقت
محوِ ذکرِ خدا ہیں جملہ طیور　　　　آدمی ہوکے تو کرے ہے قصور
سُن نصیحت مری بسمعِ قبول　　　　تو بھی کچھ یادِ حق میں ہو مشغول
وقت سے مُرغ کرکے یہ معلوم　　　　قاف پر بولتا ہے یا قیوم
اُٹھ کہ وقتِ نماز جاتا ہے　　　　وقتِ راز و نیاز جاتا ہے
مُرغ جو جانور ہے دیوے اذان　　　　اور سویا کرے تو اے انسان

نعت

کر ثنائے رسولِ راہ نما　　　　جس کے نعلین کا ہے سایہ ہُما
صلوٰۃ اس پہ بھیجے ہے جاوید　　　　ہے جو اک آسماں پہ مرغِ سفید
گر حمایت کریں نہ اس کی آل　　　　نہ جییں مرغِ عقل کے پر و بال

مدح شاہ زادہ سلیمان شکوہ

بس کہ شاہِ جہاں قمر تمثال　　　　وہ سلیماں شکوہ با تمثال
مالکِ ملک و صاحبِ دیہیم　　　　وارثِ تاج و تخت ہفت اقلیم
بادشاہ زادۂ ہمایوں فر　　　　فخرِ تیمور و بابر و اکبر

مدح نواب آصف الدولہ

اور جناب وزیر آصف جاہ   جس کی اختر سے ہی زیادہ سپاہ
آصف الدولہ اعظم الوزرا   جس کے ادنا غلام ہیں امرا
لڑنے بھڑنے کا ذوق رکھتے ہیں   مُرغ بازی کا شوق رکھتے ہیں
کیوں اولو العزم کو نہ بھاوے رزم   اُس کی تقلیب میں ہی صورتِ عزم

صفت مرغ و مُرغ بازی

شغل ہی جن کو ترک تازی کا   کھیل ہی اُن کو مُرغ بازی کا
گوشِ دل سے یہ سُن لے میری بات   اِن میں ہیں چند انبیا کے صفات
صبح خیزی ہی اور شجاعت ہی   اور ہمت ہی اور غیرت ہی
کیوں انھوں کا نہ جنگ پر ہو مزاج   صرف اس قوم کو ہی تاج کی لاج

در حال مرغ بازئ خود

اب مجھے بھی یہ شوق ہی اس کا   کہ سمجھتا ہوں مُرغ کو عنقا
قصد پالی کا جب کہ کرتا ہوں   کیا ہی ڈگ لمبی لمبی دھرتا ہوں
داب اپنی بغل میں اک مُرغا   چلتا رپ رپ قدم ہوں میں ترغا
چمنستان میں دیکھ تاجِ خروس   چاہتا ہوں کہ لیجے اس کو بھی چوس
مثلِ فولاد مُرغ ہیں اپنے   داد بے داد مُرغ ہیں اپنے
پہلوانوں کی ہیں انھوں میں صفات   پتک آہن گراں ہی اُن کی لات
ہی جو ہٹا وہ سامنے ہوتا   بیٹا رستم کا زال کا پوتا
بڑھ مُنہا سا جو ایک ہی لاکھا   خونِ مرغاں کرے ہی وہ چاکھا
اور زردا جو ایک ہی پٹھا   اُس کا پالی میں ہی بندھا لٹھا
جو ہی ڈھونکڑ وہ ایک ہی آفت   کیا کہوں اس کی جُرأت و قوت

چاہے گر چونچ سے تو وہ سنڈا — توڑ ڈالے سپہر کا انڈا
ہیں غرض خوب خوب عالی مُرغ — ہی بجا اُن کو کہیے کرسی مُرغ

درسببِ تالیفِ کتاب

تاکہ اس کھیل بیچ چیند نہ ہو — اس کے لکھتا ہوں مَیں قواعد کو
ہیں جو اِس علم میں بڑے اُستاد — اُن کو اللہ رکھے خرّم و شاد
معدنِ علم و مخزنِ اخلاق — مجھ پہ مخصوص رکھتے ہیں اشفاق
کیوں نہ ہوں روشناس عالم کے — ہیں وہ بھائی وزیرِ اعظم کے
واقعی اُن کا ہے بلند مقام — مرزا قاسم علی[1] ہے ان کا نام
رہے اُن پر وزیر کا سایا — ہے اُنھوں نے مجھے یہ فرمایا
مرغ کا کھیل ہو اگر منظور — مُرغ بازی کا سیکھ لے دستور
جنھیں اس فن میں خوب قابو تھا — نام ان کا خلیفہ بابو تھا
مُرغ بازی میں سب سے فائق تھے — یعنی اس فن میں وہ محقّق تھے
تھے انھی قبلہ گاہ کے وہ رفیق — اُن سے ہم سیکھتے تھے اس کا طریق
قاعدے جو خلیفہ مسطور — سامنے اپنے کرتے تھے مذکور
اور جو بات کرتے تھے ظاہر — اُن سے کرتے ہیں ہم تجھے ماہر
الغرض ان سے جو سُنی تقریر — مَیں نے منظوم اُسے کیا تحریر
اب وہ کہتا ہوں مَیں قواعد کُل — تا نہ دے بیٹھے کوئی آکر جُل

قاعدہ

مُرغ بازوں کی ہے یہی بانی — مثلاً ہوچکے ہوں دس پانی
گیارھویں پانی اپنا دے رومال — اگلے نے پھر لڑایا ہو فی الحال

---

[1] قاسم علی خاں نواب سالارجنگ کے بیٹے اور بہو بیگم صاحبہ کے برادر زادے تھے۔ ۱۲

اور وہ جو حریف ہو غالب — جس کے باقی ہوں پانی اب صاحب

مُرغ کا کانٹا دیکھ لے موٹا[1] — تو غرض اُس نے بس اُسے لوٹا

بازی دینی پڑی اُسے لاریب — شدّت اگلا کرے تو ہی یہ عیب

جس کے باقی ہوں پانی اے دلدار — اُن نے گر کچھ کیا تو پھر مختار

باندھے کانٹے ٹانک لیوے پلک — ہی یہ جاری سلف سے آج تلک

قاعدہ

جوڑ مرغاں کا تب بندھے ہی اخی — جب کہ دونوں طرف کی ہی مرضی

چاہیے یونہیں ڈالنا ڈنکا — جس سے راون کی کانپ اُٹھے لنکا

نہیں کوئی کرے جو ڈنکے بعد — تو وہاں یونہیں گرجے جیسے رعد

لیجیے بازی اس سے ہو کے حریف — اس میں یکساں ہیں سب قوی و ضعیف

اور جو دونوں طرف کی مرضی ہو — کہ نہیں اب لڑائی جانے دو

تو نہ اس کو خطر نہ اس کو ظفر — ترک شدّت ہی اس گھڑی بہتر

قاعدہ

ہی یہی کانٹے باندھنے کا طور — اس کو تو اپنے دِل میں کرلے غور

دونوں مرغوں کے کانٹوں کی انیاں — کیجے سوہن سے خوب سی یکساں

اور نہی جو ہوں انکی والے (کذا) — اُن کو بس لے کے جھٹ رگڑ ڈالے

ایک کپڑے کی چار پٹی پھاڑ — مُرغ بازوں کے کھیل کو لے تاڑ

وہ تو اپنے کے واسطے لے لے — وہ اُسی میں سے دُوسرے کو دے

دھجیاں آٹھ آٹھ تہ کر کر — باندھ مضبوط کانٹوں کے اوپر

انیاں کانٹوں کے ہوں نہوں کے بیچ (نہتوں؟) — کچھ نہ رہ جائے اُن میں اونچ اور نیچ

پر نہ ڈورا انی کے اوپر آئے — کہیں ایسا نہ ہو اناڑی کہائے

---

[1] محاورہ "پھوٹا" ہی اور قافیہ بھی یہی چاہتا ہی — 'اُردو'

قاعدہ

کل مقرر ہیں اس میں پانی دس   اس کے آگے جو ہو کسی کو ہوس
تو وہ رومال دے کے پانی اک اور   چھوڑ سکتا ہے مُرغ کو فی الفور
یوں لڑانے کو ہے لڑا سکتا   مُرغ کو پھر اُٹھا نہیں سکتا
گر اُٹھاوے تو ہارے پھر بازی   کچھ نہیں کام آتی دم سازی

قاعدہ

لڑانے میں مُرغ کے اگر رومال   کوئی لیوے بھگا تو پھر فی الحال
ایک پانی وہ ہار جاوے وہیں   پر جو دونوں کی ہو خوشی تو نہیں
چپکے سے تر کرے جو وقتِ مصاف   وہ بھی اک پانی ہار جاوے صاف
کرے رومال کو چھپاکے جو تر   اور قسم کھاکے جاوے صاف مُکر
نہیں کچھ چاہیے وہاں تکرار   یہی تدبیر ہے کہ ہو لاچار
دونوں رومالوں کو بلاکے عیاں   سب کے آگے نچوڑ ڈالے وہاں

قاعدہ

طبع کو شر پہ تو نہ کر مرغوب   مرغ پیشہ ہی ہیں لڑاتے خوب
کھینچ تا شر کرے نہ کوئی شریر   آدھی کرکے مفاصلے سے لکیر
ایک اپنی طرف اور ایک اُدھر   خیر سے تاکہ دیکھیں جملہ بشر
کیوں قضایا میں ہاتھ منھ ٹوٹیں   مُرغ دونوں پکڑ لیں پر چھوٹیں

قاعدہ

غیر کے مُرغے کی گئی سو چشم   تو تجھے وصاں نہیں ہے لازم خشم
دوسرے شخص کے نہ دِل کو توڑ   ایک کا کی بچا کے مُرغ کو چھوڑ

قاعدہ

ایک کا آدھا بازو آیا ہو گر　　　دوسرے جانور کی گردن پر
ہے حریف ایک ہاتھ کا مختار　　　کہ جو چاہے تو لیوے بازو اُتار
اور جو دونوں لگا دے اپنے ہاتھ　　　ہار پانی کی پھر ہے اُس کے ساتھ

قاعدہ

سارے بازو جو مُرغ کی گردن　　　ڈھانپ لیوے تو وھاں یہ ہے قدغن
کہ نہ چھیڑے کوئی نہ ہاتھ لگائے　　　اور جو چھیڑے تو ہار پانی جائے

قاعدہ

آگیا ہووے منھ میں مُرغ کے گر　　　تو الگ کھینچ لیوے چپکے سے پر
شرط ہے احتیاط اس میں ولے　　　دوسرے مُرغ کو نہ ہاتھ لگے

قاعدہ

گر شرارت سے مُرغ باز نے ہاتھ　　　مارا ہو مُرغ کو تو اس کے ساتھ
اس کی پالی سے کھینچیے باہر　　　اور کہیے کہ دور گیدی خر

قاعدہ

مُرغ دونوں جو کرتے جنگ و جدال　　　حد پہ پالی کی پہنچے ہوں فی الحال
مارتا لات مُرغ کو گو ہو　　　چونچ سے اپنی پکڑے اُس کو ہو
کھیل کی بات ہے یہی لاریب　　　وھاں اُٹھا لینا کچھ نہیں ہے عیب
نہ اٹھے حد سے تو ہے پانی کی ہار　　　وقنا ربنا عذاب النار

قاعدہ

ہے وہ مختار جس کے مُرغ کی دم　　　لگی پالی کی حد سے اے مردم
نہ اُٹھاوے وہ یا کہ لیوے اُٹھا　　　ہار جیت اس میں کچھ نہیں اصلا

مُرغ جس کا طرف ہو پالی کے / وہ اُٹھا دے تو پانی بس ہارے
پالی باہر سے کوئی شخص جھپٹ / لے اٹھا مُرغ کو تو بس جھٹ پٹ
خیر دو پانی ہارے وہ بے شک / اس میں کرنی عبث کو ہی بک بک

قاعدہ

کب چھڑاتے ہیں چشم مرغ سے خاک / مین کرنے میں ہو جنھیں ادراک
اور پر کا نہیں مضائقہ پر / رکھتے جائز ہیں اس کو اہلِ ہنر

قاعدہ

مرغ کا لڑنے میں جو ٹوٹا خار / ہوگیا ہووے سب تہوں کے پار
آدمی غیر کا بتا دیوے / تہوں کا ٹوٹنا بتا دیوے
کھول کر کانٹے دیکھ لیوے یہ بھید / سب تہوں کے جو وار پار ہوں چھید
تو تو البتہ پانی ہارے دو / ورنہ پھر اُلٹی ہار ہی اس کو
کانٹے کھلوائے غیر سے لیکن / اس میں بہتر ہی رات ہوئے کہ دن
اور اک تہ بھی رہ گیا ہو اگر / تو نہیں ٹوٹا خار از دلِ بر
کانٹے پھر کھول باندھنے یوں نہیں / جس سے اگلے کے دل کو ہو تسکیں

قاعدہ

گاہ باشد اگر یہ شبہہ ہُوا / یعنی ٹوٹا ہی کانٹا مرغے کا
دونوں راضی ہوں وھاں تو خلطے کی راہ / کچھ نہیں ہی مضائقہ باللہ
کیوں عبث قصہ مُفت کا باندھے / پھر نئے سر سے کھول کر باندھے

قاعدہ

اور اگر مُرغ کو لگے کاری / اُس کو میداں سے جھٹ بیزاری
دُوسرا لے اٹھا تو وہیں پھر / پانی ہارے یہ بات ہی ظاہر

جانور حد پہ جا پڑے جو پھڑک — تو اُسے جلد چاٹ لے نہ دھڑک
جھٹ بھڑا دیجے اس سے چونچ سے چونچ — اور کہیے کہ بھائی تو بھی پونچ
اس میں پالی کی اُس کو ہار نہیں — اور تکرار زینہار نہیں
کاری کھائی اگر اٹھا لیوے — حد سے پالی کی اور لگا دیوے

قاعدہ

بیٹھ پالی ہی میں کہے جو وہ یوں — پھر اُسے پھونک کر لگاتا ہوں
دیجیے اُس کو مہلت آدھ گھڑی — کہ مصیبت غریب پر ہے پڑی
ہے وہ مہلت کی قدر کا مختار — اس میں شایاں نہیں ہے کچھ تکرار
چاہیے آٹے کی گولیاں توڑے — چاہیے مُرغے کو سامنے چھوڑے
اس کے پہلے جو مرغے کو دے چھوڑ — تاکہ گولی دے گوندے آٹے سے توڑ
تو ہے معلوم نزد اہلِ تمیز — پالی بے شبہ پھر وہ ہارے عزیز
اس کی بے اطلاع مرغ اگر — اگلا لے جائے پالی کے باہر
سُن لے پھر میرے ای رفیق شفیق — ہار پالی کی ہے اُسے تحقیق
گیارھویں بالی کر کے دم سازی — مُرغ اپنا چھوڑے سووے بازی

قاعدہ

لڑتے لڑتے جو مُرغ مرجاوے — چاہیے دوسرا نہ گھبراوے
کردے ٹکٹکی پہ اُس کو وہیں کھڑا — اور ٹک جی کو اپنے کرلے کڑا
دوسرا اُن کا والا لات جڑے — تو یہ بازی کے دبنے پر نہ اٹھے
دھکے اور لات کی نہ ٹھیرے تو — پھر برابر رہے وہاں دونو
نہ ہوئی جیت ہار کچھ مطلق — مٹ گئی ہم دگر جو تھی نق دق

قاعدہ

چاہیے یہ کہ مُرغ باز سوائے — کوئی پالی میں ای عزیز نہ جائے

یا وہ دو مُرغ باز جاویں اور   جو کہ کانٹوں کے دیکھ لیویں طور
یا جو پالی کے رنگ کو تاڑیں   باہم اس طور جنگ کو تاڑیں

قاعدہ

رات ہو جائے اس میں تو مجبور   وہاں ناچار ہے یہ بات ضرور
مشعلیں گرد و پیش دِکھلاویں   چار مشعلچی پالی میں جاویں
رکھیں ایسا ہی مشعلوں کو جانچ   کہ نہ مرغوں کو پہنچے مطلق آنچ
نہ لگے مُرغوں کو کہیں مشعل   کہ مبادا کچھ اور آوے خلل
یعنی آپس میں ہووے دت دیکھ   اور برپا ہو مفت کی بک بک
اور ترکیب مجھ کو ہے سوجھی   آکے حاضر ہوں آٹھ مشعلچی
چار تو ہوویں چار کونوں پر   اور ہوں چار پالی کے اندر
مُرغ لگنے میں اور بھاگنے میں   سب کو لازم ہے دُور سے دیکھیں
بیچ پالی کے اُس گھڑی آنا   عیب رکھتے ہیں جو کہ ہیں دانا
گو بڑا آدمی ہو یا سردار   چاہیے اُس سے کرنی یہ تکرار
کھیل سے یہ بعید ہے حضرت   یہ ہوئی آپ سے بُری حرکت
دُوسری بار یونہیں ہو تو غرض   دیں رُپے پانچ پھر وہ اس کی عوض
کوئی اس بات سے جو ہو باہر   کھیل کا اُس سے ترک ہے بہتر

قاعدہ

نہ کڑکیے بسانِ رعد و برق   چاہیے رکھیے مرتبے کا فرق
با ادب بات کھیل کی کہیے   اور آتی نہ ہو تو چُپ رہیے
بولنا مُرغ باز کا بے جا   کسی سردار سے نہیں اچھا
اور بولے تو جس کا ہے نوکر   اُس کو لازم ہے ہو خفا اُس پر

چاہیے اُس کو دیوے ایسی سزا — کہ وہ اس بات کا اُٹھاوے مزا
اُس کا آقا کرے نہ گر تنبیہ — تو نہایت ہو کھیل میں یہ کریہ
چاہیے حاضروں کی صف کی صف — ہو سب اس مردِ آدمی کی طرف
تاک اُس کے مزاج کا گھر گھاٹ — کھیل سے اُس کے لیجے دل کو اُچاٹ

قاعدہ

اور لازم ہو اک جُدا ہو مکاں — مُرغ آ کر کے سینکے جاویں جہاں
چونچ جبڑے جہاں کہ باندھ سکیں — چاہیے سو مُرغ باز اپنی بکیں
رکھیں گودی میں اپنے مرغوں کو ڈھانک — تاکہ پلکوں کو لیویں اُن کی ٹانک
یا دوا میں کچھ اُن کو دیویں کھلا — مطلق ان چیزوں کا نہیں ہے گلا
بلکہ سُرمہ دیں اُس کی آنکھوں میں ڈال — جس طرح اپنی لیویں سنبھال
لیک کانٹوں کی کچھ دوا ملنا — ہے قیامت ہی یہ کُل چلنا
اس میں ہوتی کُدھب ہے گفت شنید — کھیل کی راہ ہے یہ بات بعید
مُرغ کا بازو ٹوٹ جاوے تو — کیا خلل ہے سمیٹ لے اس کو
ہو لہو مُرغ کا اگر جاری — تو دوا ملیے ہو کے ناچاری
کچھ نہیں ہے مضائقہ اس کا — پر جو چاہے کہ ڈورا یا کپڑا
لا کے باندھے یہ بات ہے ممنوع — عذر ہرگز نہیں ہے وہاں مسموع

قاعدہ

جوڑ اگر ایک ہووے یا دو ہوں — تین ہوں چار پانچ ہوں جو ہوں
تا بہ حدّے کہ ہوں بندھے چھ جوڑ — تو ہی پانی میں ہرتے پھرتے چھوڑ
پانچ پانی تک ایک ایک کے بعد — آیا جایا کریں بہ ساعتِ سعد
فرق دو دو گھڑی ہو پانی کا — مقتضا ہے یہ قدردانی کا

ہی کھلاڑی کو طور یہ بھاتا ۔۔۔ ایک آتا ہو ایک ہو جاتا
چھٹے پانی سے تین تین گھڑی ۔۔۔ چاہیے دیر کیوں کہ پھر ہو کھڑی

قاعدہ

یہی اُستاد نے کہی ہی بات ۔۔۔ جب گھڑی پانچ رہ گئی ہو رات
دونوں مُرغوں کو صاحبِ تیمار ۔۔۔ ہیں پھر اُس آن فاعلِ مختار
شوق سے مُرغوں کو سُلا رکھیں ۔۔۔ دو گھڑی دِن تلک جُدا رکھیں
اس سے آگے جو اور بھی ہو دیر ۔۔۔ تو وہ عائد ہی ہار پانی کی پھیر
اور اگر ہو اجازتِ طرفین ۔۔۔ تو گھڑی چار پانچ کیجیے چین
یہی دستور ہی یہی معمول ۔۔۔ دونوں راضی ہوں جو کہیں سو قبول
ہم دگر کی نہ ہو رضامندی ۔۔۔ جس میں وہ بات ہو خبر خندی

قاعدہ

ڈنکا جب پڑ چکا ہو مُرغے پر ۔۔۔ دُوسرا چاہیے ٹونٹے باندھے پر
چھیلنے بیٹھے اپنے مُرغ کے خار ۔۔۔ تو پھر البتہ کیجیے تکرار
شرط کرلی ہو پہلے سے تو سند ۔۔۔ نامناسب ہی آگے جد و کد

قاعدہ

ہووے جو کوئی مُرغ بازی پر ۔۔۔ اُس پہ لازم ہی باندھنی یہ کمر
دو رُپے سے بدے نہ بازی زیاد ۔۔۔ اس میں گو وہ خفا ہو یا کہ ہو شاد
ہی نہایت رُپے وہ تین بدے ۔۔۔ فائدہ (کیا) کہ ملکِ چین بدے
اس سے آگے بدے تو ہی تفضیح ۔۔۔ نہیں رکھتے اسی کی بازی صحیح
جتنے کا مُرغ باز ہو نوکر ۔۔۔ دھیان رکھے وہ اپنی آمد پر
یا کہ اُس کا نہیں اگر چاہا ۔۔۔ بد دیا اُس نے آدھا درماہا

اور اس سے زیادہ جھوٹ ہو بات آٹھویں روز کی ہو کلّی لات
بازی جب تک نہ آوے آٹھواں دن پھر لڑائی حرام ہو اُس بن

قاعدہ

ہو گنہگار تو بھی انصاف کیجیے ایک بار جُرم معاف
پھر جو تقصیر ہووے بارِ دگر کرے غصّہ وہ جس کا ہو نوکر
اور سردار اُس کا دیوے جو ٹال سب کو لازم ہو دیویں اس کو نکال
کریں باہر اُسے حویلی سے کہ وہ بدتر ہو دیھے تیلی سے

قاعدہ

پچھلے کانٹوں بھی مُرغ لڑتے ہیں لاتیں کھا کھا بہم بپھرتے ہیں
دھجیوں کا نہیں ہو کچھ مذکور اور سب کچھ ہو ویسا ہی دستور
اُس کی بھی ہو اسی طرح کی ریت ہو اسی ڈھب کی ہار ویسی ہی جیت
چاہیے جتنی لیجے بازی بد ہو جُوا منھ کا بات ہو یہ سَند

ہم کو یہ مثنوی اسی قدر دست یاب ہوئی۔ مگر شُبہ ہوتا ہو کہ پھر بھی شاید خاتمے کے کچھ شعر رہ گئے ہوں۔ بہرصورت یہ ایک نایاب چیز تھی جو نذرِ ناظرین کر دی گئی۔

سیّد انشا کی بابت تمام تذکرہ نویسوں کا خیال ہو کہ وہ سخت ہاجی تھے۔ زرا سی بات پر اپنے حریف کے ایسا پیچھے پڑتے تھے کہ اُس غریب کو اپنی جان چھڑانا بھاری ہوجاتی تھی۔ یہی اُن کے دیوان سے بھی ثبوت ملتا ہو مگر ہم اس وقت ایک نئی ہجو پیش کرتے ہیں جس کے نو بند ہیں مگر چوں کہ کئی بند نامہذب ہیں اس لیے ایسے بند جو دائرۂ تہذیب میں ہیں ان کو انتخاب کیا جاتا ہو۔ افسوس ہو کہ اب یہ قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ کس پر برس پڑے ہیں اور کس بے چارے کو ہدفِ ملامت بنایا ہو بظاہر کوئی گویا معلوم ہوتا ہو ؎

خصوصاً جس کی ماں سارنگی اور بابا تنبورا ہو
وہ جھنڈو کیوں نہ پھر جس بات میں دیکھو ادھورا ہو غنیمت ہو تناری ری ہی میں اپنی جو پورا ہو

بھلا کیا آدمیت جانے مجہول النسب ایسا
مٹھوسا پن یہ ہو جس میں نسب ایسا حسب ایسا

یہ بھونڈا پن نہ جس پہ آنکھ ہرگز خوک و سگ ڈالے — یہ کاٹھی جوں مسافر کے گلے میں پھانسی ٹھگ ڈالے
توارہ یہ بڑے ساکھو سے ہوویں جوں الگ ڈالے — تندی یہ کہ اک فیروز شہ کی لاٹ ہگ ڈالے

عجب گوبر گنیش اُس کی وہ شکلِ پُرکدورت ہے
معاذ اللہ اک ماہی مراتب کی سی صورت ہے

نجیب ایسا نہ ہو دُنیا کے کیوں کر کارخانے میں — مکرّر ہو گیا ہر جمع[1] اجتیں اس گھرانے میں
ہوئی ہے صرف سب اوقات دھاں گلنے بجانے میں — غرض کچھ ذات اس کی مغتنم ہے اس زمانے میں

سلیقہ بات کا یہ کچھ زباں جب اپنی کھولے ہے
تو اپنے والدِ مرحوم کو محروم بولے ہے

گھمنڈاں دومڑوں کا یہ نہایت مجھ کو بھاتا ہے — جو کہتے ہیں کہ ہم کو بادشاہوں ساتھ ناتا ہے
جب اس کو دیکھتا ہوں کیا کہوں کیا یاد آتا ہے — اصالت دیکھیو اس کی کہ اک پردے میں گاتا ہے

نہ سرگم گانے پر لازم ہو اس کو شرط کیوں بدنی
کہا ہے اس کو بھوپت خاں نے سارے گامے کی بدنی

مگر سا سر شکم کچھ سوس سے بھی اور بدتر ہے — شرائیں مار آسا ہر عضب مانند اژدر ہے
پتھورا کے محل جو تڑا . . . نفاخ صرصر ہے — وہ جھجّی[2] جیسی کچھوی ناک مینڈک منھ چھچھوندر ہے

تولد پائے بڑکنی[3] سے دل بادل جھاوا
تو اس کو بھی نہ کہہ سکیے کہ ہے اس شخص کا باوا

---

[1] یہ مصرع صحیح نہیں معلوم ہوتا اسی لیے سمجھ میں نہیں آیا۔ ۱۲

[2] جھجھی

[3] بڑکنی ایک ہتھنی کا نام ہے دل بادل ایک ہاتھی کا نام تھا جو زمانۂ آصف الدولہ میں تھے۔ صحیح مصرع غالباً یوں ہے:
تولد پائے بڑکنی سے گر دل بادلا جھاوا

تراشا ہی یہ بھینسا سُر عجائب صنع آذر نے — بجا ہی اُس کے دروازے پہ گینڈے آکے دیں دھرنے
لگے ہی دو قدم چلنے میں اُلٹے سانس یوں بھرنے — پڑے گرمی کے مارے ہنہپلتے جیسے ہوں ارنے
قیامت نوعِ انسانی میں اُلٹا قسم ہی اس کا
بنیٔ ارزم مساق بلیغ اسم ہی اس کا[1]

کبھی ہاروت بیٹھا ہی کبھی ماروت کی صورت — نہ لگا کھاوے اُس سے دیو کی اور بھوت کی صورت
عَرَق سے اُس کے ٹپکے ہی سُور کی موت کی صورت — عیاں ہی اُس کی اس بک بک سے برجِ حوت کی صورت
کہا جن نے اُسے ہی یہ ملک لندھور کا بیٹا
خدا بخشے گنہ اُس کے غرض ہی وہ بہت اچھا

کوئی اور شخص ہی اور اس سے یہ غلطی ہوئی ہی کہ اُس نے سید انشا کے متعلق کہیں کچھ کہہ دیا ہی۔ انشا سخت برہم ہوئے ہیں اور ایک ہجو کہہ ڈالی ہی۔ اُس کو بھی پورا نقل نہیں کیا جا سکتا چند بند پیش کیے جا سکتے ہیں ؎

می نہد گوش کسے بر سخنِ غیبت گو — ہست ابلیس نہاں در بدنِ غیبت گو
منبعِ خبث بود جملہ تنِ غیبت گو — باید انداخت . . . در دہنِ غیبت گو
پف ردہ . . . من و . . . زنِ غیبت گو

ناسزا گفتنش از حد حساب افزون است — جملہ آفاق بہ عندیہ او مابون است
ایں چہ تخمے است نہ دانم کہ حقیقت چون ست — زاں جماعت کہ قلوب ہمہ شاں زوخون است
ہمہ آمادہ بہ گردن زدنِ غیبت گو

تا شباں گاہ برآید بہ سبویش شاشم — گام آہستہ زنم بر سر و ریش شاشم
وا کنم ہر دو لبش را و بہ مویش شاشم — آں چناں گرم براں ریش و گلویش شاشم
کہ چکد شاشہ فرد از دہنِ غیبت گو

---

[1] یہ مصرع صاف نہیں پڑھا گیا اصل کے مطابق لکھا گیا ہی۔ ۱۲۔

ہمارے خیال میں مصرع شاید یوں ہی۔ "بنی آزرم مساق بلیغ اسم ہی اس کا" جس کے اُلٹنے سے ابنِ مرزا قاسم علی نام نکل آتا ہی۔ (م اُردو)

مُردہ شوئیست کہ در دہر کسے ثانی نیست قبح جوئیست کہ در دہر کسے ثانی نیست
بادہ گوئیست کہ در دہر کسے ثانی نیست زشت روئیست کہ در دہر کسے ثانی نیست
دیدۂ آں گلہ و پیرہنِ غیبت گو

اژدہائے است کہ آتش بہ زند عالم را بلع سازد ز دمِ خویش بنی آدم را
می کشد تشنہ شدہ جملۂ آبِ یم را نہ گزارد بہ جہاں شائبۂ شبنم را
ظاہر است ایں ہمہ اژدم زدنِ غیبت گو

ہمہ گویند پر افسردۂ ای قرمِ ساق بہرہ از مسخرگی بردۂ ای قرمِ ساق
مال دریوزہ گری خوردۂ ای قرمِ ساق نامِ جد و پدر آوردۂ ای قرمِ ساق
لعنت اللہ بریں زیستنِ غیبت گو

دشمنِ دینِ محمدؐ بود آں نا انصاف سخن معجزہ می گوید و می خندد صاف
در شریعت نگرد از نظرِ استخفاف طعنہ بر سبع مثانی زند و سورۂ قاف
ایں خیالات بود بیخ کنِ غیبت گو

با حسینؓ ابنِ علیؓ بغض و عداوت دارد صد دلائل پئے انکار شہادت دارد
بنگر ایں کس چہ قدر ہا کہ شقاوت دارد طعن و تشنیع بر اولادِ رسالت دارد
کردۂ غور بہ چشمک زدنِ غیبت گو

عرق آلودہ چو با بخت نگوں می آید ارز بانش ہمہ خوف ... و... ل می آید
آں ... رد چہ بہ گویم کہ چوں می آید مادہ خوکے است کہ از آب بروں می آید
ایں چنیں است بلے آمدنِ غیبت گو

دوسری ہجو

بہ تحقیق یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ ہجو کس کی لکھی گئی اور سید انشا معمول سے زیادہ کس پر مہربان ہوگئے ہیں مگر نظم میں ضیا کا نام آیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جس کی ہجو لکھی ہے وہ شخص مذہب امامیہ ہی رکھتا تھا اس لیے

خیال ہوتا ہے کہ یہ شاید میر ضیا ہوں گے۔ یہ دہلوی الاصل تھے مگر عظیم آباد میں جا رہے تھے۔ ۱۱۹۶ھ تک زندہ تھے بعض کے نزدیک ۱۱۹۴ھ میں انتقال کیا۔ بہرحال یہ ایک خیال ہے اور مجھے اس پر کوئی وثوق نہیں ہے۔ مگر ہجو کے بعض بند لکھتا ہوں۔ ؎

ملعون دروغ بلع کند تا ہمین رید　　　شکلش چناں ترش کہ ہمہ صاف کین رید
گر انگبیں خورد ہمہ سرکنگبین رید　　　زانساں کہ از ممر مری ایں لعین رید
کے شپرک ز راہ دہن ایں چنین رید

خفاش ہرچہ بد برش آید بہ دام او　　　سرگشتہ کور موشش برائے سلام او
چلپاسہ چوں کنیزک و حر با غلام او　　　تعفین مُردگان نرود از مشام او
نکہت اگرچہ صد چمنِ یاسمین رید

خوش می کند شراب عداوت سبو سبو　　　ذوالاحترام را نہ کند ہیچ آبرو
نامش برند ہم چو معاویہ کو بہ کو　　　از خرقہ تشیّع پوچش حذر کہ او
شمر و سنان ابنِ انس را سنین رید

تذلیلِ اوست جملۂ امراض را علاج　　　پیداست بہرِ لاعنِ او سور و ابتہاج
قوت ہمی فزاید و خشنیتِ مزاج　　　خاقاں چو لعن کردن او را دہد رواج
صد مشک نافہ آہوے صحرائے چین رید

باما چگونہ می سزدش کرد انحراف　　　باید بہ ایں جریمہ دو صد عجز و اعتراف
ہاں ای ضیا بہ کوش بہ خود ایں قدر ملاف　　　طبع بلند ماست بلے ہم چو کوہ قاف
سی مُرغ کلکِ ما ہمہ تاج و نگین رید

زیں نعرہ می رسد بہ فلک صدمۂ عظیم　　　مُخِ دماغِ چرخ برآید ز خوف و بیم
سازیم از لکد کرۂ خاک را دو نیم　　　آلودہ با بلاغم احشا و خون و ریم
آں ہر دو شاخ سرزدہ گاو زمین رید

دررودہ اش سحاب تواند بسر برد		برقِ جہاں بہ دام ز گورش شررِ برد
بوے عفونتش نفسِ خوک دخر برد		انشا ثواب گلشن ہجوش اگر برد

گاؤ نسیمِ صبح گہ عنبریں رید

انشا کو طلسمات اور شعبدوں کا بھی بڑا شوق تھا۔ اُن کے دیوان میں یہ چیزیں کثرت کے ساتھ موجود ہیں لہٰذا ایک طلسمِ غیر مطبوعہ نقل کرکے ہم اپنے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں ؎

وہ گھڑا جو کہ ہو مجھولا سا		آٹھ دس سیر جس میں پانی ہو
اُس کو چھلکا کے آب خورہ ایک		رکھ دو اور گرد اس کے لیوا دو
تو گھڑا بھی وہ پھر اُٹھ آئے گا		جو اُٹھا لیجیے آب خورے کو

ہے یہ حاضر طلسم انشا پاس
جب اسے چاہو آپ کر دیکھو

بمبئی کی اُردو صحافت!

(از جناب رئیس احمد صاحب جعفری، ایڈیٹر روزنامہ انقلاب بمبئی)

بمبئی کی اُردو صحافت ۱۸۹۹ء تک[1]

اُردو صحافت کا اگر نگاہِ غور سے مطالعہ کیا جائے، تو اس عجیب اور حیرت انگیز حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ گو صوبۂ بمبئی کو یہ فخر حاصل نہیں ہے کہ وہ اُردو داں حلقوں میں شمار ہو، پھر بھی "اُردو صحافت کی تعمیر اور تشکیل میں اس کا نمایاں حصّہ ہے۔

شمالی ہند اُردو کا وطن ہے، کلکتہ کا فورٹ ولیم کالج اُردو کی تربیت گاہ ہے، بنگال اور بہار میں ربط ہے، بہار اور صوبے جات متحدہ میں وابستگی ہے، صوبے جات متحدہ اور دلّی میں مماثلت ہے، دلّی اور پنجاب ایک ہیں، پھر اگر ان سب مقامات میں اُردو زبان کو فروغ حاصل ہوا تو مایۂ حیرت نہیں، حیرت اگر ہوسکتی ہے تو اس پر کہ بمبئی جیسے دُور دراز مقام پر، جہاں پہلے سے گجراتی کا سکّہ چل رہا تھا، اور مرہٹی کی عمل داری تھی اور انگریزی کی سُلطانی قائم ہوچکی تھی ——— اُردو زبان کو فروغ حاصل ہوا۔

یہ صحیح ہے کہ یہاں کی اُردو صحافت بالعموم شمالی ہند کے ادیبوں اور اخبار نویسوں کے ہاتھوں پھلی پھولی پروان چڑھی۔ لیکن کیا اس امر واقعہ سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ بمبئی کے عوام میں، اور خواص میں، اُردو زبان کو اپنانے اور مقبول بنانے کا جذبہ پہلے سے موجود تھا؟ اگر یہ نہ ہوتا تو یہاں سے اُردو اخبارات کیوں کر نکلتے؟ کس طرح کامیابی حاصل کرتے؟ اب سے ۷۰، ۸۰ سال پہلے کی صحافت کا آج کی صحافت سے، اس

[1] بمبئی میں پہلی اُردو کانفرنس ۲۳-۲۴-۲۵ فروری ۱۹۴۵ء کو بابائے اردو مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقّیٔ اُردو (ہند) کی زیرِ صدارت منعقد ہوئی تھی یہ مقالہ اسی کانفرنس کے لیے لکھا گیا۔

زمانے کی دشواریوں کا آج کی سہولتوں سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ آج معمولی سے معمولی اخبار بھی سرکاری نیم سرکاری، تجارتی اور فلمی اشتہارات گراں تر نرخوں پر حاصل کرسکتا اور کرتا ہو۔ اُس زمانے کے اخبارات، اشتہارات سے بالکل محروم تھے، ان کا مدارِ حیات تمام تر خریداروں پر تھا اور ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ بنیاد آج کی بنیاد سے زیادہ مضبوط تھی۔

پون صدی پہلے کے اخبارات

سرِدست یہ کہنا مشکل ہو کہ بمبئی میں سب سے پہلا اُردو اخبار کون تھا؟ لیکن سنہ ۱۸۶۸ء سے باقاعدہ سلسلہ قائم کیا جاسکتا ہو۔ جب حکومتِ ہند نے رجسٹری کتب و اخبارات کا قانون نافذ کیا تھا، اس سال بمبئی سے اُردو کے تین اخبار نکلتے تھے۔

(۱) 'کشف الاخبار'

(۲) 'برقِ خاطف'

(۳) 'لطیف الاخبار'

سنہ ۱۸۸۵ء میں 'عندلیبِ ہند' ایک اخبار جاری ہوا یہ پہلے ہفتہ وار تھا، پھر ہفتے میں تین بار ہوگیا' اسی سال ایک اور اخبار 'جہاں نما' جاری ہوا، یہ اُردو اور فارسی میں شائع ہوتا تھا۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں دو اخبارات جاری ہوئے۔

(۱) 'ارمغان'

(۲) 'خیرخواہِ اسلام'

سنہ ۱۸۸۳ء میں حسبِ ذیل اخبارات جاری ہوئے:۔

(۱) 'الطاف'

(۲) 'مظہر'

(۳) 'شوکتِ اسلام'

(۴) 'دیدۂ اسلام'

(۵) 'خادمِ ہند'

(۶) 'ملیٹری السٹریٹیڈ'

۱۸۸۵ء میں اخبار 'ارمغانِ ہند' کا اضافہ ہوا، ۱۸۸۶ء میں ایک نیا اخبار 'شوکتِ ہند' اشاعت پذیر ہوا۔ ۱۸۹۰ء میں 'جوہر' جاری ہوا، ۱۸۹۱ء میں 'مخبر' اور ۱۸۹۳ء میں حسبِ ذیل اخبارات جاری ہوئے:۔

(۱) روزنامہ 'دلیلِ اسلام'

(۲) 'انڈیا گزٹ' ہفتہ وار

(۳) 'عالم افروز' ہفتہ وار

۱۸۹۴ء میں کچھ اور نئے اخبارات جاری ہوئے :۔

(۱) 'معین الملک'

(۲) 'زبان'

(۳) 'مسلم ہیرالڈ'

۱۸۹۵ء میں یہ نئے اخبارات نکلے :۔

(۱) 'بشیر الملک' ہفتہ وار

(۲) 'آئینۂ ہند' ماہ وار

(۳) 'مرآۃ الاخبار'

۱۸۹۶ء میں دو نئے اخبارات نکلے :۔

(۱) 'بمبئی پنچ بہادر'

(۲) 'سفیر'

۱۸۹۷ء میں کئی نئے اخبارات جاری ہوئے :۔

(۱) 'اوِدھ پنچ' ہفتہ وار

(۲) 'نیرِ اسلام' "

(۳) "آزاد پنچ" ہفتہ وار

(۴) "جسٹس آف دی پیس" ہفتہ وار

(۵) "مقبولِ عالم" ہفتہ وار

(۶) "منصفِ دکن" "

(۷) "سلطان الاخبار" روزنامہ

کچھ اور پُرانے اخبارات!

میں عرض کرچکا ہوں، بمبئی کی اُردو صحافت کے آغاز کی صحیح تاریخ فی الوقت نہیں بیان کی جاسکتی۔ اس سلسلے میں گراں قدر معلومات حاصل ہوسکتے ہیں، آیندہ مزید تحقیق و تفتیش کی جائے، تو پوری جامعیت کے ساتھ ایک مکمل تاریخ بھی مرتب ہوسکتی ہے۔

اوپر کی سطروں میں اخبارات کی جو فہرست میں نے پیش کی ہے، یہ اُس وقت سے شروع ہوتی ہے جب ۱۸۶۷ء میں حکومتِ ہند نے رجسٹری کتب و اخبارات کا قانون نافذ کیا تھا، مذکورہ فہرست حکومتِ بمبئی کے محکمۂ تراجم مشرقیہ کے شعبۂ اُردو کے انچارج مسٹر برنی کی دیدہ ریزی کا نتیجہ ہے، لیکن بمبئی کی اُردو صحافت کا یہ نقطۂ آغاز نہیں ہے۔ مزید تحقیق اور تجسس کے بعد اس سے پہلے کے بھی کچھ اجزا دستیاب ہوسکتے ہیں۔ اب میں انھیں پیش کرتا ہوں۔

مشہور فرانسیسی مستشرق موسیو گارساں دتاسی کی کتاب "ہندستانی ادب از ۱۸۵۰ء تا ۱۸۷۷ء" کا ترجمہ انجمن ترقی اُردو (ہند) کی طرف سے شائع ہوچکا ہے۔

گارساں دتاسی اگرچہ پکا عیسائی تھا، اور اسے ہندستانی لٹریچر سے بالعموم اور ہندستانی یا اُردو زبان سے بالخصوص بہت دلچسپی تھی۔ کیوں کہ ہندستان میں تبلیغ عیسائیت کی رفتار پر وہ باقاعدہ نظر رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی یہ دلچسپی مورخانہ حیثیت سے آج ہمارے لیے بڑے کام کی چیز ثابت ہورہی ہے۔

گارساں دتاسی نے اپنے پانچویں خطبے میں جو ۷ دسمبر ۱۸۵۵ء کو پڑھا گیا، اُردو پریس کی تدریجی ترقی پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ بمبئی کا ذکر وہ اس طرح کرتا ہے:-

"بمبئی میں تین یا چار ہندستانی اخبار ہیں! ان چار میں سے صرف دو کے نام معلوم ہو سکے :-

(۱) 'بمبئی کا ہرکارہ'

(۲) 'زمانہ بہار'

۱۸۵۹ء کے خطبے میں گارساں دتاسی نے بمبئی کے دو اخبارات کا ذکر کیا ہے :-

(۱) 'راست گفتار'

(۲) 'بامداد' (یہ عیسائیوں کا مذہبی پرچہ تھا)

۱۸۶۸ء کے خطبے میں اس نے صرف ایک اخبار کا ذِکر ان الفاظ میں کیا ہے :-

"سورت میں جہاں سے کبھی کوئی اُردو کا اخبار شائع نہیں ہوا تھا، مئی ۱۸۶۷ء سے باقاعدہ ایک اُردو ہفتہ وار جاری ہوا ہے، اس کی زبان نہایت فصیح ہے اس اخبار کا نام منظور الاخبار ہے!"

'کشف الاخبار' کے متعلق میں عرض کر آیا ہوں کہ حکومتِ ہند کے قانون کے بموجب اس کی رجسٹری ۱۸۶۸ء میں ہوئی تھی، اب گارساں دتاسی کے ایک خطبے سے اس کی تاریخ آغاز بھی معلوم ہوگئی -

۱۸۶۲ء کے خطبے میں گارساں دتاسی 'کشف الاخبار' کا ذِکر کرتا ہوا لکھتا ہے :-

"بمبئی سے کشف الاخبار ۱۸۶۱ء سے نکلنا شروع ہوا ہے یہ ہفتہ وار ہے، اور ہر بدھ کو شائع ہوتا ہے، اور چھوٹی تقطیع کے ۱۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔ لکھنؤ کے منشی امان علی اس کے ایڈیٹر ہیں۔ ہر نمبر کے شروع میں ایک چھوٹی سی نظم ہوتی ہے جس میں اس نمبر کا پورا پروگرام لکھا ہوتا ہے!"

چند اور نام

گارساں دتاسی کے خطبات اور حکومتِ بمبئی کے محکمۂ تراجم مشرقیہ کی فہرست سے اخبارات کے ناموں کا ایک خاکہ پچھلے صفحات میں پیش کیا جاچکا ہے، بایں ہمہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ فہرست بھی مکمل ہے۔ خوش قسمتی سے مذکورہ فہرست میں سے متعدد اخبارات کے فائل مجھے دستیاب ہوگئے۔ان فائلوں کے مطالعے سے، معاصرانہ نوک جھونک، آپس کی چھیڑ چھاڑ یا تنقید و تبصرے کے ضمن میں بھی بعض اخبارات کے نام معلوم ہوئے، ان کی مختصر فہرست یہ ہے :-

(۱) 'تحفہ' غالباً ۱۸۹۴ء

(۲) 'درافشاں' " ۱۸۹۴ء

(۳) 'نجم الاخبار' " ۱۸۹۴ء

(۴) 'آئینۂ ہند' " ۱۸۹۵ء

(۵) 'قاسم الاخبار' " ۱۸۹۶ء

(۶) 'مسلم' " ۱۸۹۶ء

(۷) 'گل زارِ سخن' " ۱۸۹۳ء

مذکورہ اخبارات کی اشاعت اور حیثیت

اوپر کی سطروں میں جن اخبارات کا ذکر ہوا، ان میں سے چند پر مختصر تبصرہ مع نمونہ تحریر میں آگے چل کر پیش کروں گا، لیکن عام تعارف کی غرض سے یہاں اتنا لکھنا مناسب ہر کہ یہ اخبارات بالعموم کتابی سائز پر نکلتے تھے، خواہ روزانہ ہوں یا ہفتہ وار، زیادہ سے زیادہ ضخامت ۱۶ صفحات پر ہوتی تھی اور کم سے کم ۴ صفحات۔ اشاعت بالعموم ایک سو سے لے کر پانچ سو تک محدود ہوتی تھی کتابت ناقص، کاغذ خراب، چھپائی باصرہ شکن۔

خبریں بہت کم ہوتی تھیں، اور جو کچھ ہوتی تھیں وہ احوال اور اخبار سے زیادہ عجائب وغرائب پر مشتمل ہوتی تھیں، یا ذاتی نونک جھونک ہوتی تھی، اندازِ کلام بسا اوقات سوقیانہ ہوتا تھا، معاشرتی اور سماجی خبریں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ سیاسی خبروں پر بالخصوص ان کی تفصیلی نوعیت پر بہت کم لکھا جاتا تھا۔

خلیفۃ المسلمین سے والہانہ عقیدت، روس سے للّٰہی دشمنی، برطانیہ کی مداخلت، یونان کی سرکشی اور سرتابی، ریاست ہائے بلقان کی شورش، ترکوں کی بہادری اور شجاعت، ایران اور روس کی مخاصمت۔ ان مسائل پر حمیتِ دینی اور غیرتِ مذہبی، اور جوشِ ملی کا نہایت دلیری سے یہ اخبارات مظاہرہ کرتے تھے، لیکن سیاسیات ہند پر، مسلمانانِ ہند کی کس مپرسی پر، حکومتِ انگلشیہ کی داخلی پالیسی پر گفتگو کرنے سے دامن بچاتے تھے۔

روزانہ اخبارات میں بھی خبریں بہت کم ہوتی تھیں، مضامین زیادہ ہوتے تھے۔ مضامین کے لیے یہ ضروری نہیں تھا، کہ وہ سیاسی ہوں، علمی، اقتصادی، روحانی، طبی، مذہبی، سماجی، معاشرتی، غرض ہر قسم کے مضامین ہوتے تھے۔ مقامیات پر ذاتی نوک جھونک کے علاوہ بہت کم توجہ کی جاتی تھی۔

بعض اخبارات پر تبصرے

انجمنِ اسلام اسکول (بمبئی) کی لائبریری میں، بمبئی کے بعض نہایت قدیم اخبارات و رسائل کے کچھ فائل موجود ہیں۔ خوش قسمتی سے، مجھے ان کے مطالعے کا موقع ملا۔ ان میں سے کچھ اخبارات پر میں تبصرہ کرنا چاہتا ہوں، تاکہ عہدِ ماضی کے اخبارات اور بمبئی کی صحافتِ اُردو کی ایک جھلک آپ کے سامنے آجائے۔

حدیقۃ الاخبار

میرے سامنے اس وقت 'حدیقۃ الاخبار' مورخہ یکم اپریل ۱۸۴۷ء کا ایک پرچہ ہے۔ اسی سال یہ پرچہ اشاعت پذیر ہوا ہے، پہلے صفحے پر بطرزِ مثنوی ایک نظم ہے، دوسرے پر خبریں ہیں۔

یکساں خبروں کی ایک سرخی ہے اس ضمن کی دوسری خبریں "ولہ" کے ماتحت دی گئی ہیں، خبروں میں اظہارِ رائے اور رقتِ قلب کے نقوش بھی موجود ہیں، انشاپردازی اور عبارت آرائی کا جوہر بھی ہے ایک خبر کا عنوان ہے "مرگِ شوق!" عبارت یہ ہے:۔

"مورخہ ۲۶ ماہِ مارچ ۱۸۴۷ء کی صاحبِ ٹائمس آف انڈیا یہ واردات اپنے صحیفۂ سامی میں رقم کرتے ہیں، کہ ایک پارسی کوئے میں کود کر ہم آغوشِ بحرِ فنا ہوا بعد تحقیقات کے اہالیانِ جیوری نے فتوا دیا کہ متوفی مذکور خود بہ خود ہم کنارِ تلاطم قضا ہوا ولہ شیخ ابراہیم و محمد تار داؤد ساسوں کی گودی میں کچھ کام میں مشغول تھے۔ قضائے کار ان کو یکایک سخت ضرب لگی، زخمی ہوئے، فوراً ان کو جمشید جی جی جی کے دارالشفا میں لے گئے۔ ________"

"پاداشِ تقصیر" کے عنوان کے ماتحت متعدد خبریں درج ہیں، تین ملاحظہ ہوں:۔

"صاحبِ ٹائمس آف انڈیا کے ۲۸ مارچ کے صحیفۂ سامی سے واضح ہوا، کہ ایک کم سن لڑکی کھڑکی میں سے گرگئی، جس سے اس کے سینے میں ضربِ شدید پہنچی۔ حضرت حکیم علی الاطلاق جلد شفا بخشے! ولہ دو لڑکے ہندوزاد کم سن قریب دیر کے ایک لوہے کی پتی سے بازی کر رہے تھے۔ قضائے کار پتی ان کے

ہاتھوں سے چھوٹ گئی، اور ان کو بھی ضرب لگی۔ حدیقۃ الاخبار۔ ہم اپنے بھائی ہم وطنوں کو تاکید کرتے ہیں، اس قدر تغافل نہ کریں حتی المقدور غافل نہ رہیں۔ ولہ ماہِ مارچ کی ۲۵ تاریخ کو یہ انکشاف ہوا کہ ہرمزجی پسٹن جی پریس میں کچھ کام کر رہا تھا قضائے کار ایک لوہے کا ٹکڑا اس کے پاؤں پر گر گیا اور اس سے اس کو نہایت صدمہ پہنچا، اسی دم اس کو استخواں ساز کے پاس لے گئے۔!"

یہ خبریں بھی ہیں اور ایڈیٹوریل نوٹس بھی، خبر کے ساتھ حکیم علی الاطلاق سے دعا بھی ہے ہم وطن بھائیوں کو نصیحت بھی ہے۔

اس سلسلے میں چند خاص باتیں قابلِ غور ہیں:۔

(۱) انگریزی اخبارات کو "حدیقۃ الاخبار" کی اصطلاح میں معاصر کے نام سے یاد نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے نام کے پہلے "صاحب" کا لفظ ایزاد کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً "صاحبِ ٹائمس آف انڈیا" "صاحبِ پائنیر" وغیرہ۔

(۲) کنواں کو "کوا" لکھا گیا ہے۔

(۳) فتویٰ کے بجائے فتوا، املا کی یہ وہ اصلاح ہے، جسے انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) جاری کرنا چاہتی ہے، مثلاً اعلیٰ کے بجائے اعلا۔

(۴) ہسپتال کے لیے دارالشفا استعمال ہوا ہے۔

(۵) مندر کو دیر سے یاد کیا ہے۔

(۶) کھیل کود کے بجائے بازی لکھا ہے۔

(۷) "بون سٹر" (BONE SETTAR) کا بہترین ترجمہ "استخوان ساز" کیا ہے۔

۱۲ مئی سنہ ۱۸۷۴ء کے حدیقۃ الاخبار میں، ایک بڑی دلچسپ خبر شائع ہوئی جو درج ذیل ہے:۔

"گوالیار کے مہاراجہ نے زمانۂ پیشین میں ایک عورت ہندو خوب صورت پری رو بطور داشتہ کے رکھی تھی اور اس کے دو لڑکے بھی پیدا ہوئے تھے جو فی الحال نوجوانی کو پہنچے ہیں۔ تھوڑے دن کا عرصہ ہوا کہ مہاراجہ اور اس عورت کے درمیان بے اتفاقی واقع ہوئی اور بہ سبب نااتفاقی کے وہ عورت مہاراجہ کو چھوڑ کے شہر لکھنؤ میں قیام پذیر ہوئی، اور وہاں مسلمان ہوگئے ایک مسلمان کے ساتھ نکاح کیا اتفاقاً ان دنوں میں بطورِ

میر کے مہاراجہ کا لکھنؤ میں گزر ہوا، اور وہاں یہ بات اس کی سماعت میں آئی کہ میری داشتہ یہاں آئی ہے اور مسلمان ہو کے کسی مسلمان کے ساتھ اس نے نکاح کیا ہے، مہاراجہ کو از سرِ نو عشق پیدا ہوا غلبۂ شوق میں دیدار کا تمنا ہوا، عقلِ سلیم پابہ زنجیر ہوئی۔ آرزومند زلفِ مشکیں گلوگیر ہوئی، آتشِ رخسار شمع روئے رشکِ پروانہ بنادیا، دلِ شیدا کو، کہ مدت تک اس لیلیٰ عذار کے ساتھ رہا۔ مانندِ مجنوں کے دیوانہ بنادیا آخر اس کے گھر جانے کا ارادہ کیا ہر چند مصاحب مانع ہوئے کہ جانا آپ کا اس کوچے کی طرف باعثِ درد و خجلت بلکہ موجبِ ہتکِ عزت ہے، کسی کا کہنا نہ مانا بلکہ کوئے جاناں میں جانے کو جان سے عزیز جانا قصہ کوتاہ چند سپاہی ساتھ لےکر اس گھر کے قریب پہنچے اور عورت کو بہ جبر گھر سے نکال کر اس مقصد میں تھے کہ اپنے گھر لے جاویں، اہالیانِ پولیس کو خبر ہوئی، انھوں نے زنِ مذکورہ کو چھڑایا اور مہاراجہ صاحب کو وہاں سے مکان تک پہنچایا جب کمشنر پولیس مسٹر نیوبری صاحب کو خبر ہوئی تب صاحب مذکور نے لکھنؤ سے کوچ کرنے کا حکم دیا، دوسرے دن مہاراجہ صاحب اسپیشل ٹرین میں سوار ہوکر لکھنؤ سے سدھارے۔ خلافِ عقل و تدبیر بازی ہارے ——— "

اس عبارت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ساری خبر میں کوئی نیا پیراگراف استعمال نہیں ہوا ہے۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خبریں کس طرح فصاحت و بلاغت کے دریا میں غوطہ دے کر شائع کی جاتی تھیں۔

یہ اخبار رائل سائز کے چار صفحوں پر نکلتا تھا، خبروں کا کام اداریے سے اور اداریے کا کام خبروں سے لیا جاتا تھا۔

'مخبرِ سرور'

یہ اخبار بھی چار صفحات پر شائع ہوتا تھا، ملکی خبریں بہت کم ہوتی تھیں۔ عالمِ اسلام کی بالعموم اور دولتِ عثمانیہ اور خلیفۃ المسلمین کی خبریں بہت ہوتی تھیں۔

۹ نومبر ۱۸۷۶ء کا پرچہ میرے سامنے ہے نمونتہً اداریہ درج کیا جاتا ہے:-

"کلکتہ کی رہنے والی ایک ضعیفہ، نیک اطوار نے جب سنا کہ کلکتہ میں مجروحین و یتیم و بیوگان شہدائے عساکرِ سلطانی کے واسطے روپیہ جمع ہوتا ہے، اور سلطان خلداللہ ملکہٗ کی فوج کفار نمک حرام سے برسرِ مقابلہ ہے، تو فوراً اٹھی اور اپنے ہاتھ کے کنگن طلائی جو اس نیک ذات نے اپنے کفن کے خرچ کو رکھ چھوڑے تھے لے جاکر انجمنِ عام کلکتہ کے نذر کیے اور بولی کہ یہ روپیہ میں نے راہِ خدا میں عساکرِ سلطان کے مجروحین وغیرہ کو دیا۔

ازاں جملہ ایک دوسری عورت بھی آئی اور ایک ہزار رُپیہ لاکر اہالیانِ انجمن کو تسلیم کیا۔
آفرین صد آفرین ان نیک بخت عورات کی ہمتِ مردانہ کو سچی دِل سوزی اسی کا نام ہی، کلکتہ میں بیس ہزار اور بڑودہ میں پانچ ہزار رُپیہ چندے کا جمع ہوا۔"

خبریں اس اخبار میں بھی کم ہوتی تھیں مضامین زیادہ، لیکن اس اخبار کی خبروں اور مضمونوں میں عبارت آرائی کم ہوتی تھی، عموماً زبان صاف اور سادہ استعمال کی جاتی تھی۔

'عندلیب ہند'

یہ اخبار ——— 'حدیقۃ الاخبار' اور 'مخبرِ سرور' کے مقابلے میں زیادہ مکمل اخبار تھا، ضخامت بارہ صفحات کی تھی، خبریں بھی کافی ہوتی تھیں تجارتی اشتہارات کی بھی کثرت تھی، واقعات اور مسائل پر ایڈیٹوریل بھی لکھا جاتا تھا، پالیسی مرنجاں مرنج تھی۔

۱۔ اپریل ۱۸۸۱ء کے پرچے میں نئے زارِ روس کی تخت نشینی پر ایک اداریہ لکھا گیا ہی، جس سے اخبار کی پالیسی، اسلوبِ نگارش، اندازِ غور و فکر پر روشنی پڑتی ہی۔ افتتاحیہ یہ ہی:-

"شاہِ روس ابھی نوجوان بادشاہ ہی جس کے دِل میں مدّتوں سے منصوبے گٹھ رہے ہیں، جن کی تعمیل سے وہ بوجہ مزاحمتِ پدری قاصر تھا اب ضرور انتظامِ باغیاں سے فارغ ہوکر بروئے کار آئیں گے۔ اور بعض سلطنتوں میں کھڑ بھڑ مچائیں گے۔ کس لیے کہ یہ قاعدۂ مُستمرہ ہی کہ ہر بادشاہ جب نیا نیا تختِ حکومت پر جلوہ گر ہوتا ہی تو وہ خواہ مخواہ اپنی نام آوری اور علو ہمتی جتانے کے واسطے کچھ نہ کچھ کارروائی کیا ہی کرتا ہی مثلاً جب شاہ نکلس نے بعد معرکۂ سباستی پول قضا کی اور زار مرحوم اپنے باپ کے جانشین ہوئے تو انھوں نے یومِ تخت نشینی سے تا روزِ مرگ کیسے کیسے ہاتھ پانو پھیلائے، اب زارِ حال بھی بقولکہ ع

ہرچہ پدر نتواند پسر تمام کند

اولوالعزمی کے جوہر دکھائیں گے اور جو خیالات کہ پیش نہادِ خاطر ہیں وہ قوت سے فعل میں لائیں گے۔"

اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں تجارتی، اور موسمی خبریں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ عبارت عام فہم اور رواں ہوتی تھی، روس اور ممالکِ اسلامیہ کی آویزش، ترکی اور فرانس کی چپقلش اور دوسرے بین الاقوامی معاملات و مسائل پر نسبتاً آزادی سے یہ اخبار بحث و گفتگو کرتا تھا۔

خیر خواہِ اسلام

یہ اخبار آٹھ صفحات پر شائع ہوتا تھا، اس میں کافی خبریں ہوتی تھیں، لیکن غیر اہم، جتنی غیر اہم اتنی ہی مفصّل بھی۔ بعض دِل چسپ خبریں بھی شائع ہوتی تھیں مثلاً ۲۵ر مارچ ۱۸۸۶ء کے پرچے میں ایک خبر شائع ہوئی ہے:-

"پورٹ بلیر کا موسم نہایت عمدہ معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ وہاں کے لوگوں کی عمر زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ جوبلی کے دن جو قیدی رہا ہوئے تھے اُن میں کئی باشندے حیدرآباد کے ہیں، جو قریب سو برس کے گزرے کہ علتِ ڈکیتی میں حبسِ دوام کے لیے قید ہوئے تھے، اور اب وہ رہا ہوئے ہیں۔"

اس خبر کے عجیب پہلو یہ ہیں کہ

(۱) ڈکیتی کے الزام میں اس زمانے میں حبسِ دوام کی سزا ہوتی تھی۔

(۲) حبسِ دوام کے قیدی سو سو برس تک جیل میں رکھے جاتے تھے۔

(۳) عمریں کم و بیش سوا سو برس کی ہوتی ہوں گی۔

اس اخبار میں اداریہ شاذ و نادر ہوتا تھا۔ مراسلات کی کثرت ہوتی تھی۔ طبّی اور روحانی اور مذہبی مضامین بھی اس میں شائع ہوتے تھے۔

۸ر جنوری ۱۸۸۶ء کے پرچے میں انجمنِ اسلام احمد آباد کا وہ سپاس نامہ شائع ہوا ہے جو "حضور فیض گنجور نواب گورنر صاحب بہادر بمبئی بہ القابہ ادام اللہ شوکتہ" کے حضور میں پیش کیا گیا تھا۔ خاص بات یہ ہے کہ گورنر کو یہ سپاس نامہ فارسی زبان میں دیا گیا تھا۔

'مخبر'

یہ بھی ہفتہ وار شائع ہوتا تھا، اس میں مُلکی اور غیر مُلکی خبریں کم ہوتی تھیں مقامی یعنی بمبئی کی خبریں زیادہ سے زیادہ ہوتی تھیں یہ ضروری نہیں تھا کہ ہر پرچے میں اداریہ ہو، اور جس پرچے میں اداریہ ہو تو اس کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ اس کا کوئی عنوان بھی ہو۔

اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں مضامینِ خاص، مراسلات، منظومات وغیرہ کی

پھر بار نہیں ہوتی تھی ۔

۳۰ اکتوبر ۱۸۹۱ء کے پرچے میں ایڈیٹر نے لیورپول کی مجوزہ مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں ایک پُرزور افتتاحیہ لکھ کر مسلمانوں کو توجہ دلائی ہو کہ وہ مسٹر عبداللہ کوئیلم کی ضروری امداد کریں، تاکہ یہ مسجد جلد از جلد تعمیر ہو سکے۔

'عالم افروز'

یہ ہفتے میں تین بار شائع ہوتا تھا، یہ انجمن امامیہ کا آرگن تھا اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ ریاستی ہند کے واقعات پر بھی تبصرے کرتا تھا۔

اس اخبار میں بھی خبروں سے اداریے کا اور اداریے سے خبروں کا کام لیا جاتا تھا۔

یہ شیعہ اخبار تھا، لیکن "سنی شیعہ" تنازعات کا علم بردار نہیں تھا، مُلکی اور غیر مُلکی سیاسیات میں ایک مسلمان کی حیثیت سے رائے دیتا تھا۔ البتہ نواب محسن الملک سے بہت خفا تھا ان کے خلاف اس اخبار کی زہر چکانیاں شائستگی اور تہذیب کے حدود سے بھی گزر گئی تھیں۔

اس اخبار میں تجارتی اشتہارات کافی ہوتے تھے، جس سے اندازہ ہوتا ہو کہ اس کی اشاعت معقول تھی۔

۲۰ دسمبر ۱۸۹۳ء کا پرچہ میرے سامنے ہو، اس میں والیانِ ریاست کے سفر و سیر اور گل گشتِ فرنگ پر بڑے سخت الفاظ میں لے دے کی ہو یہ اخبار اس کا سخت مخالف تھا کہ والیانِ ملک اپنی رعایا کی گاڑھی کمائی سیرِ فرنگ میں برباد کریں، مہاراجہ بڑودہ کے متعلق لکھتا ہو:-

"سُنا جاتا ہو کہ اس مرتبہ مہاراجہ صاحب بڑودہ دو برس تک ولایت میں رہیں گے، ۲۵ لاکھ رُپے سالانہ کا تخمینہ ہوا ہو: غرض کہ ولایت کی سیر میں ۵۰ لاکھ پہ پانی پھر جائے گا۔"

نواب صاحب رام پور کے بارے میں لکھتا ہو:-

"آج کل آپ انگلستان کے دیہات میں مقیم ہیں جہاں آپ شیروں اور خرگوشوں کا شکار کرنے والے ہیں، ہمارے نزدیک اپنے ملک میں اگر یہ شکار کھیلتے تو بہت کم خرچ ہوتا!"

اپنے اداریوں میں بڑی سوجھ بوجھ کی باتیں یہ لکھتا تھا۔ اُس زمانے میں ہندستان کے لوگ بڑے

شوق سے بیرسٹری پاس کرنے انگلستان جایا کرتے تھے، یہ اخبار اس قسم کے مسافروں کو مخاطب کرکے لکھتا ہی :-

"بیرسٹر تو ہمارے مُلک میں بہتیرے ہیں، ہندُستان کو تو اس وقت ضرورت ایسے لوگوں کی ہی، جو یورپ کی صنعت وحرفت میں کامل دست گاہ رکھتے ہوں!"

اس اخبار میں لطیفے بھی درج ہوُا کرتے تھے ایک لطیفہ ملاحظہ ہو :-

"کسی جلسے میں ایک جرمن صاحب شیخی بگھار رہے تھے کہ جرمنی زبان سب سے قدیم اور پاک ہی۔ چناں چہ بہشت میں حضرتِ آدم بھی یہی بولتے تھے ایک ظریف مجمع میں بیٹھے ہوے تھے یہ بات کاٹکر بولے، جب ہی بہشت سے نکالے گئے تھے!"

ملکہ وکٹوریہ کی بیوگی کے بعد ایک خبر اس اخبار میں شائع ہوئی تھی جو شاید آج بھی دِل چسپی سے خالی نہ ہو :-

"حضوُر ملکہ معظّمہ نے اپنے شوہرِ عالی قدر پرنس البرٹ آں جہانی کے مرقد کے بائیں طرف اپنی آرام گاہ تیار کروا رکھی ہی پرنس البرٹ کا پُتلا اس قبر کی داہنی طرف جنگی لباس زیبِ بر کیے ہوے قائم کیا گیا ہی اور ایک گوشے میں پر پھیلائے فرشتوں کی تصاویر کندہ ہیں، حضوُر ممدوحہ نے جو کتبہ اپنی آخری آرام گاہ کے قریب نصب کرایا ہی اس کی عبارت کا ترجمہ یہ ہی۔ میرے پیارے خوش رہیے، آپ کی بہبُودی ہو آخرکار میں بھی آپ کے جوارِ محبّت میں آسایشِ دائمی کے لیے آؤں گی اور خداوندِ عیسیٰ مسیح کے ساتھ جن کا جلالِ ابدی اور بے زوال ہی، میں اور آپ باہم جاکر ملیں گے!"

'محمڈن ہیرالڈ'

چھوٹے سائز کا آٹھ صفحوں پر شائع ہوتا تھا۔ ایک صفحہ انگریزی میں شائع ہوتا تھا، خبریں کم ہوتی تھیں، مختلف معاملات ومسائل پر چھوٹے چھوٹے نوٹ ہر ہفتے دیئے جاتے تھے۔

طرزِ نگارش اور اس زمانے میں بمبئی کی مالی حالت کا سرسری جائزہ لگانے کے لیے ۳۱ر جنوری ۱۸۹۳ء کا یہ اداریہ ملاحظہ ہو :-

"سرکاری رپوٹ سے معلوم ہوا کہ بمبئی پریسیڈنسی کی کل آمدنی سالِ گزشتہ میں چار لاکھ پانچ ہزار تھی

۴/۱ ۲ لاکھ سے زیادہ رُپیہ سوداگروں سے وصول ہوا، اہلِ پیشہ سے ۴۸ ۸۳ ۸۴ اُرپی، دُکان داروں سے ۴۴۵۰۰، کارخانوں سے ۲۵۱۵، مالکانِ جائداد سے ۸۹۴، بار برداری والوں سے ۹۵۴۰، ملازمت پیشہ سے ۱۱۴۰۳۰، کمپنیوں سے ۱۸۰۹۲، سودی کاغذ سے ۲۲۶۹ ---!"

آج کی سرکاری آمدنی کو ۱۸۹۳ء کی آمدنی سے کوئی نسبت ہے؟

'مسلم ہیرالڈ'

یہ روزانہ اخبار تھا، کتابی سائز کے آٹھ صفحوں پر شائع ہوتا تھا ایک صفحے میں دو کالم ہوتے تھے۔

اس روزانہ اخبار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ پہلے صفحے پر "خبروں کا چمن" عنوان کے ماتحت بھانت بھانت کی خبریں غایت درجہ اختصار کے ساتھ یعنی ایک ایک دو دو سطروں میں دی جاتی تھیں، باقی سات صفحے مقالات، ادارات، مراسلات، منقولات، مضامین خاص، تجربات خصوصی، غزلیات نقد و تبصرہ وغیرہ کے لیے وقف تھے۔

۲۷ر جولائی ۱۸۹۴ء کے اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی ہے:-

"نارتھ ویسٹرن ریلوے کمپنی اپنی اوّل درجے کی تمام گاڑیوں میں وہ آلہ نصب کر رہی ہے جس کے ذریعے سے مسافر لوگ ٹرین کی چلنے کی حالت میں ریل روکنے کی استدعا کر کے اس کو روک سکتے ہیں!"

معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک یہ جدّت ان، ڈبلو، آر ہی تک محدود تھی، دوسری ریلوں میں گاڑی روکنے کی زنجیر نہیں لگائی گئی تھی، کیوں کہ چند روز ماقبل کی ایک اشاعت میں اس اخبار نے ریلوے کے مسافروں کے لیے کچھ ہدایتیں شائع کی ہیں، ان میں ایک یہ تھی کہ اگر کسی وجہ سے چلتی ہوئی گاڑی رُکوانی ہو، تو اُس کی ترکیب یہ ہے کہ سُرخ یا سفید رومال گاڑی کی کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر اُس وقت تک ہلاتے رہو جب تک گارڈ نہ دیکھ لے وہ یہ منظر دیکھتے ہی گاڑی روک لے گا۔

اس اخبار میں ایک جدّت یہ بھی ہوتی، کہ پہلے صفحے پر اندر کے تمام مضامین کی فہرست بھی دے دی جاتی تھی۔

'بشیر الملک'

یہ ہفتہ وار اخبار تھا، رائل سائز کے چار صفحوں پر نکلا کرتا تھا ریاستی معاملات پر بھی تنقید کرتا

تھا یہ تنقید کہیں کہیں تخویفِ مجرمانہ کی صورت بھی اختیار کرلیتی تھی۔
خبریں نہ ہونے کے برابر، مضامین بہت طول طویل، اندازِ بیان سلجھا ہوا عبارت نہ مقفّا نہ رنگین سادہ، صاف، عام فہم۔
بعض پرچے اداریے کے بغیر شائع ہوتے تھے، کبھی کبھی ایک کالم نقد و تبصرے کا بھی بڑھا دیا جاتا تھا اس اخبار کے چند پرچے (اگست ۱۸۹۴ء) میرے سامنے ہیں۔

'کشف الحقائق'

یہ سولہ صفحے کا ایک ماہ وار رسالہ تھا، یہ دینِ مسیحی کا مبلغ تھا، زیادہ تر مذہبی مقالات شائع ہوتے تھے، جن میں اسلام کے عقائد پر جرح کرنے کی، اور دینِ مسیحی کو دُنیا کا برحق دین ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ مضامین رُوکھے پھیکے ہوتے تھے۔

'آئینۂ ہند'

ہفتہ وار اخبار تھا برطانی ہند اور ریاستی ہند کے معاملات اور مسائل پر سیر حاصل بحثیں کیا کرتا تھا، اس پرچے میں خبروں کے خلاصے بھی شائع ہوتے تھے یہ اخبار والیانِ ریاست کی معزولی اور ریاستوں کے معاملات میں حکومت کی مداخلت کا مخالف تھا اور اس سلسلے میں برابر حکومت پر نکتہ چینی کرتا رہتا تھا۔
کاغذ نہایت خراب، کتابت اور طباعت اس سے بدتر، کئی برس تک یہ اخبار جاری رہا ۱۸۹۵ء سے لے کر ۱۸۹۸ء تک کے پرچے میری نظر سے گزرے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنا ایک حلقہ بنا لیا تھا اس میں اس کی کافی قدر تھی۔ ضخامت وہی چار صفحے، کبھی کبھی ضمیمہ مستزاد۔

'انڈیا گزٹ'

ہفتے میں ایک بار شائع ہوتا تھا، ضخامت ۴ صفحے، ایک صفحہ خبروں کے لیے وقف تھا، باقی تین حصوں میں مضامین اور مراسلات شائع ہوتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے ادارتی نوٹ بھی مختلف معاملات اور مسائل پر شائع ہوتے رہتے تھے۔
اس اخبار میں ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کبھی کبھی کارٹون بھی شائع ہوتے تھے۔

خبروں میں کوئی تنوع نہیں ہوتا تھا ، زیادہ تر منقول ہوتی تھیں اور کچھ سنی سنائی ، زبان صاف اور سادہ استعمال کی جاتی تھی ۔

ملکی معاملات پر یہ سوچ سمجھ کر اظہار رائے کرتا تھا ، کانگریس کا مخالف تھا ، لیکن کانگریسی رہناؤں کے باہمی اختلاف (۱۸۹۵ء) نے جب یہ نوبت پہنچا دی کہ معاملہ پولیس تک پہنچ گیا ، اور اینگلو انڈین اخبارات نے کانگریس والوں کا مذاق اُڑانا شروع کیا تو اس سے ضبط نہ ہو سکا ، اس نے لکھا :-

"اینگلو انڈین اخبارات کے ہاں گھی کے چراغ جل رہے ہیں کہ نیشنل کانگرس کے ممبروں میں پھوٹ پڑگئی ہو اور جب یہ نااتفاقی اس درجے تک پہنچ گئی ہو کہ پولیس میں دوپٹا رپائی کی نوبت آئی تو مخالفوں کو کیوں نہ خوشی ہو ، گو مسلمانوں کو کانگرس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو ، لیکن اہلِ ہنود کے اغراض میں خلل واقع ہوتا ہوا دیکھ کر انھیں بھی افسوس ہوتا ہو ! ———"

اس اخبار کے ۱۸۹۵ء سے لے کر ۱۸۹۶ء تک کا فائل میری نظر سے گزرا ہو اس میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ ایک کالم "لوکل" کے عنوان سے مقامیات کے لیے مخصوص تھا ۔

'بمبئی پنچ بہادر'

ہفتے وار اخبار تھا ، فکاہی اور ظریفانہ مضامین پر مشتمل ہوتا تھا ۔ خبریں بھی ظریفانہ رنگ میں چھاپی جاتی تھیں ، جن میں ضلع جگت اور رعایتِ لفظی کا خیال خاص طور سے رکھا جاتا تھا ۔ پہلے اس کے ایڈیٹر کوئی صاحب عبدالصمد تھے ، پھر عبدالحمید فرخ نے اس کی عنانِ ادارت سنبھال لی ۔ یہ مرحوم سید جالب ایڈیٹر 'ہم درد' اور 'ہم دم' کے بھائی تھے ۔

۳ مئی ۱۸۹۶ء کے پرچے میں ایک خبر شائع ہوئی ہو ملاحظہ ہو :-

"زارِ روس ہندستان کے سبز باغ دیکھ کر خار کھائے بیٹھا ہو ، اس غم میں زار ہو گیا مگر اس کے مزرعۂ دل میں اس گل زار کی کشتِ ہوس ہری بھری ہو سب راستوں سے ہار گیا تو ہرات کی راہ کو منزلِ مقصود کا راستہ سمجھا ، چناں چہ زمینی آنتوں (ریلوے لائن) کی لین ڈوری ڈال دی ہو !"

یہ تو خبر کا نمونہ ہوا ، اب ذرا اداریے کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو ۔ یہ وہ زمانہ ہو کہ سوڈان میں شورش ہو رہی

ہیں اور برطانوی حکومت اپنی کارروائیاں جاری رکھتے ہوئے ہے، "سوڈانی گڑبڑ" کے عنوان سے یہ اخبار لکھتا ہے :-

"سوڈان میں گڑبڑ مچنے والی ہے، اس لیے ٹڈی دل فوج ہندستان سے روانہ کردی گئی ہے۔

ہم کو اس بات کی بڑی ادھیڑبن لگی ہوئی تھی کہ سیہ نصیب کالے آدمیوں کو ہر جگہ سب سے پہلے کیوں بھیجا جاتا ہے؟ مدت مدید کے بعد یہ عقدہ کشا ہوا کہ اگر ناز پروردہ گوروں کو لڑائی میں بھیجا جائے تو وہاں کی سختیوں اور گرمی کی شدت سے ان کا رنگ بھی سیاہ بھونرا ہوکر چہرے ولایتی بوٹ بن جائیں۔ پھر کالے، گوروں میں تمیز ہی کیا رہے؟ کالی رعایا کو گورنمنٹ نے گوروں کا کفارہ سمجھ رکھا ہے، عقبیٰ کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے گناہوں کا کفارہ بن گئے۔ دھڑلے سے جو چاہیں کریں گویا دین کے تمام مزے اللہ نے انھی کے لیے بنائے ہیں، اب رہا دنیاوی کفارہ، اس کے لیے یہ کالی بھیڑیں (ہندستانی) موجود ہی ہیں۔ مثل ہے گھر کی مرغی دال برابر، سب چاہا گردن مروڑی اور ڈکار گئے!"

۲۱ راگست ۱۸۹۶ء کے پرچے میں کریٹ کی شورش پر ایک اداریہ لکھا گیا:-

"یہ اور شگوفہ کھلا چوں کہ یہ لوگ بھی عیسائی ہیں اس لیے ہماری گورمنٹ کا بہت بڑا حق ہے کہ بغاوت کرنے میں ان کی مدد کرے مگر ایسا نہ ہو کہ ہماری گورمنٹ انجن چھوڑ گھسیٹن میں بڑ جائے کیوں کہ سوڈانیوں کا نمونہ دیکھ ہی لیا کہ ایسی قلیل تعداد وحشیوں کی جماعت نے ہماری طرف کے بڑے بڑے بہادروں کا منہ پھیر دیا۔ خفت مٹانے کے لیے خواہ کچھ ہی مشہور کردیا جائے مگر ؎

ای داغ دل جانتا ہے کسی کا!

پتلونیں ڈھیلی ہوئیں، بڑے بڑے صاحب بہادر سوچ رہے ہیں کہ کس مصیبت میں آپھنسے کہ دانہ پانی تک بند ہوگیا ہے۔ جب اس ناشایستہ فوج نے ہماری شایستہ فوج کے چھکے چھڑا دیے تو ترک بھائی جنگ شایستگی کے پتلے ہیں، لڑائی کے لیے اُدھار کھائے بیٹھے ہیں، گورمنٹ ذرا سوچ سمجھ کے دست اندازی کرے تو بہتر ہے۔"

اس اخبار میں ظریفانہ شاعری کے نمونے بھی شائع ہوتے رہتے تھے بمبئی کی خاص الخاص عوام پسند زبان میں ایک غزل شائع ہوتی ہے۔ ضرور سنیے ؎

چہاکٹ جو ہوکے اوٹے یہ تیرے پڑیلا ہوں
پڑا

دو باٹلی سے آج زیادہ پٹیلا ہوں
بوتل

مجراجو مَن کے نوٹ مَیں اس کو دئیلا ہوں
دیتا

کس وٹ کے ساتھ بھسے لپٹ کے لٹیلا ہوں
شان

چل چال آج حال مرا پوچھتا ہو کیا

جانی ترے فراق میں مر کر جئیلا ہوں
جیا

آتے نہیں اوالی موالی اٹھانے کو

دارو مَیں آج پی کے گٹر میں پڑیلا ہوں
نالی　پڑا

کبھی تو دیکھ لیں گے وہ باڑی سے جھانک کر
احاطہ

مَیں جھاڑ کی طرح سے سڑک پر گڑیلا ہوں
گڑا ہوا

چندی بزار چار بجے روز شوق سے

کھاتا مَیں خوب نانذ سے بھونبلی تلیلا ہوں
مچھلی　تلی ہوئی

بے ڈیرلے کے کام نکلتا ہو اس لیے
کوڑی پیسہ

رانڈاں یہ جانتی ہیں کہ مَیں سرفریلا ہوں
رنڈیاں　سرپھرا ہوا

جو کام چاہتے ہو وہ لیتے ہو مجھ سے تم

بالا فکٹ کا ہاتھ تمھارے لگیلا ہوں
لڑکا مفت کا　لگا

اُردو محاورے کے ہوں کس طرح اپنے شعر

لوفر مَیں ممبئی میں تو پیدا ہویلا ہوں
ہوا

پنچیانہ رنگ میں یہ اخبار، دوسرے کی بالعموم اور ہم رنگ معاصرین کی بالخصوص پگڑیاں اُچھالنے میں بڑا دلیر تھا۔ ایسے موقع پر اندازِ تحریر ضرورت سے زیادہ سوقیانہ اور عامیانہ ہوجایا کرتا تھا۔

'مظلوم دکن'

یہ بھی ہفتے وار اخبار تھا، بمبئی سے شائع ہوتا تھا، اور سیاسیاتِ حیدرآباد دکن کے لیے مخصوص تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس کے ایڈیٹر صاحب کو ریاست حیدرآباد سے، اس کے عہدے داروں سے، اس کے وزیروں اور امیروں سے، اس کے فرماں روا سے سخت دشمنی تھی۔ ایسے تیز تند، ناشائستہ اور عریاں توہین آمیز اور اشتعال انگیز مضامین یہ اخبار شائع کرتا تھا کہ حیرت ہوتی ہے یہ زندہ کیوں کر رہا؟ آج کہ آزادیٔ تحریر و تقریر نسبتاً پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ حاصل ہے اس قسم کے مضامین اگر کوئی اخبار شائع کرے تو وہ ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

اس اخبار نے بڑی دیدہ دلیری سے حضورِ نظام پر یہ الزام لگایا کہ وہ درپردہ روس سے سازباز کیے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ نظامِ دکن کی ذاتی مصروفیات پر بھی سخت الفاظ میں نکتہ چینی کی۔ نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک پر نہایت مکروہ الزامات عائد کیے۔ ۱۰ اگست ۱۸۹۷ء کے پرچے میں اس نے خاص طور پر حیدرآباد کی حکومت کو ہدفِ مطاعن بنایا ہے۔

اس بے باک گوئی اور آزاد نویسی کے باوجود حیرت ہے کہ حکومتِ دکن یا حکومت بمبئی نے اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ اس اخبار سے اس سلسلے میں جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے:-

"دیکھنے والے حیران ہیں کہ قیصرِ ہند اور ایک اخبار جی دونوں برابر خم ٹھونک رہے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ دُنیا میں اس سے زیادہ بہادر کوئی نہیں ہے جو پبلک کے لیے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالے۔"

(مظلوم دکن ۱۰ اگست ۱۸۹۷ء)

اس اخبار کی بے باکی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس نے سرِ ورق پر "ضوابطِ اخبار" کے عنوان سے چند ضابطے درج کیے ہیں، جن میں سے پہلا ضابطہ یہ ہے:-

"نامہ نگاروں کو عام اجازت ہے کہ جو چاہیں وہ لکھیں، ذمے دار ہم ہیں!"

اس اخبار کی ضخامت آٹھ صفحات تھی، کاغذ خراب، کتابت طباعت معمولی۔

'سفیر'

یہ اخبار ہفتے میں دو بار نکلتا تھا، کافی عرصے تک جاری رہا۔ دو سال کی جلدیں (۱۸۹۶ء، ۱۸۹۷ء) میری نظر سے گزریں۔ یہ پرچہ بہت سنجیدہ مضامین شائع کرتا تھا۔ ذاتی مناقشات سے اخبار کے کالم بھرنے کا عادی نہیں تھا۔ ملکی، ملی، مذہبی معاملات پر نہایت جچی تلی رائے ظاہر کرتا تھا۔

اس کی ضخامت ۴ صفحات تھی لیکن ان چار صفحات کا نہایت مناسب استعمال کیا جاتا تھا۔ خبریں بھی اس زمانے کے عام معیار کے مطابق اچھی خاصی دی جاتی تھیں، مضامین بھی خاصے ہوتے تھے، اداریے میں اہم معاملات پر نہایت ثقاہت اور سنجیدگی سے اظہار رائے کیا جاتا تھا۔

'سلطان الاخبار'

یہ روزانہ اخبار تھا، کتابی سائز پر شائع ہوتا تھا۔ ایک صفحے میں دو کالم ہوتے تھے ۸ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔

زیادہ سے زیادہ دو کالم خبروں کے لیے وقف تھے۔ باقی ۷ صفحات مضامین خاص، مراسلات، رزمیہ، منظومات اور مقالاتِ ادارت کے لیے وقف تھے۔ ترکی حکومت اور خلیفۃ المسلمین سے اس اخبار کو بھی والہانہ شیفتگی تھی۔

یونان کی سرکوبی کے لیے جب ترکی فوجیں البانیہ اور اناطولیہ سے نکلیں اور کام یاب و کامراں ہوکر آگے بڑھنے لگیں، تو ۷ جولائی ۱۸۹۷ء کے اخبار میں اس نے ایک اداریہ "ترکی فوج" کے عنوان سے لکھا۔ اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو ؎

یہ ترکانِ طرّار کی فوج ہے　　　　کہ شیرانِ خوں خوار کی فوج ہے
بلا ہے قیامت ہے آفت ہے یہ　　　　کہ اعمالِ دشمن کی شامت ہے یہ
زمیں اس کے آگے سمٹ جائے گی　　　　بلندی پہاڑوں کی گھٹ جائے گی
بھلا اس سے انساں لڑے کیا مجال　　　　اگر جن بھی آئیں تو ہوں پائمال

ترکوں کی تلوار صاعقہ بار نے پلک جھپکتے یونانیوں کے خرمنِ ہستی کو خاک سیاہ کر کے ہوا میں اُڑا دیا۔ اٹلی انگلستان کا اور انگلستان حیرت سے فرانس کا منھ تکتا ہے، انگلش پارلیمنٹ کے ممبر گھبرائے ہوئے یونانیوں کی طرح ایک دوسرے کا منھ نوچ رہے ہیں۔

رچرڈ شیردل کے ہم وطنوں میں کسی نے جامِ شہادت نوش نہیں فرمایا، باوجودے کہ انگریزی اخبار کہتے ہیں کہ یہ جواں مرد ہر لڑائی میں سب سے چار قدم آگے رہتے ہیں مگر شجاعانِ انگلستان کو زد سے بچنے کا ایسا ڈھب یاد ہے کہ سینکڑوں بہادروں میں سے صرف چھ نے چرکا کھایا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کوئی ڈاکٹر ان خراشوں کا امتحان کرنے لگے، ورنہ قلعی کھل جائے گی۔ کیوں کہ ترکوں کے لگائے ہوئے گھاؤ اور ہی طرح کے ہوتے ہیں، ان شیروں کے شمشیروں کے زخم میں ٹانکا نہیں لگتا، چلو یہ کیا تھوڑا ہے کہ ان سینہ زوروں سے پیچھا چھڑا کر صحیح سلامت انگلینڈ میں پہنچ گئے۔ زندگی رہی تو سوڈان کے وحشیوں یا سرحد کے پٹھانوں یا برہما کے نامرادوں سے لڑ بھڑ کر بیس بیس تمغے لٹکالیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ دغابازی اور جعل سازی دوسری بات ہے ورنہ فرنگی اور ترکوں کا مقابلہ لاحول ——— یورپ کی شجاع ترین قوم کے شجاع ترین زمانے کا شجاع ترین جرنیل (نپولین) آج سے سو برس پہلے کہہ گیا ہے کہ ترکوں کی تلوار فرنگیوں کی سنگینوں سے کہیں زیادہ غارت گر ہے! ترک ——— ! محاوراتِ فرنگ میں "تلوریے کو کہتے ہیں REGULAR TURK. یورپین شمشیرزن کی انتہائی تعریف ہے!"

اس اداریے سے اس اخبار کی جرأت، حق گوئی اور اصابت رائے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر بھی عبدالحمید فرخ تھے۔

'جسٹس آف دی پیس'

یہ بھی ہفتے وار اخبار تھا، سائز بڑا تھا، ایک صفحے میں چار کالم ہوتے تھے۔ دو تین کالم خبروں کے لیے وقف تھے، باقی صرف مضامین اور مقالات، ادارت کے لیے۔

یکم نومبر ۱۸۹۶ء کے پرچے میں مشہور ترک دشمن اور اسلام آزار یورپین مدبر گلیڈ اسٹون پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک شذرے میں لکھا ہے:-

"گلیڈ اسٹون کے لیے ہر طرف سے یہ آواز بلند ہو رہی ہے کہ وہ کاروبارِ سلطنت میں شریک ہو جائے، مگر ایک ایسے بڈھے کو سلطنت کے جنجال میں دھکیلنا بہت بڑا ظلم ہوگا۔ جب یہ سلطنت کے جھمیلوں میں پھنسے گا

تو ہمارے سلطان المعظم کی شان میں نئی گالیاں کون تراشے گا؟ خدا جانے لوگ اسے سلطنت کے کاروبار میں کیوں گھسیٹ رہے ہیں؟ کسی کو لارڈ بیکنس فیلڈ کی یہ پیشین گوئی بھی یاد ہے کہ انگلستان کو جو سب سے بڑا صدمہ پہنچائے گا وہ پیرِ نابالغ یعنی بڈھا گلیڈ اسٹون ہے!"

'مقبولِ عالم'

یہ ہفتے وار اخبار تھا۔ چھوٹے سائز کے چار صفحوں پر شائع ہوتا تھا۔ حسبِ معمول خبریں کم ہوتی تھیں مضامین پر زیادہ توجہ کی جاتی تھی۔ ۱۸۹۷ء کی جلد اس وقت پیشِ نظر ہے، لیکن کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں ہے۔

'گُل زارِ سخن'

بمبئی کے جرائد و صحائف کا ذکر ختم ہوا لیکن یہ باب ختم کرنے سے پہلے میں ایک رسالے کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں، اس کا نام 'گل زارِ سخن' تھا۔ یہ ایک ماہ وار گُل دستہ تھا۔ ہر مہینے ایک طرح دے دی جاتی تھی، اس پر شعرائے ہند طبع آزمائی کرتے تھے، وہی مجموعۂ افکار "گل زارِ سخن" کے نام سے ہر مہینے شائع ہوتا تھا، اس میں صرف غزلیں شائع ہوتی تھیں، مضامین اور مقالات کی اس میں بہت کم گنجایش تھی۔
معلوم ہوتا ہے اس گل دستے نے خاصا ادبی وقار حاصل کرلیا تھا، اس لیے کہ اس کے مشاعروں میں ہندستان کے چوٹی کے شعرا بھی شریک نظر آتے ہیں، مثلاً جلالؔ لکھنوی، داغؔ دہلوی وغیرہ۔
یہ بیس صفحات پر شائع ہوتا تھا۔ ایک آدھ صفحہ اشتہار وغیرہ کے لیے بھی وقف ہوتا تھا۔ جنوری ۱۸۹۳ء کی طرح تھی ع

ہمیں دل سے پسند اپنے خریداروں کی باتیں ہیں

اچھی اچھی غزلیں شائع ہوئی ہیں، بالخصوص جلالؔ اور داغؔ کی غزلیں تو بے نیازِ ستایش ہیں۔ لیکن اس مشاعرے میں بمبئی کا کوئی شاعر نظر نہیں آتا۔ گورکھ پور، آگرہ، برہان پور وغیرہ کے شعرا شریکِ بزم ہیں۔

بمبئی کی اُردو صحافت کا نیا اور شاندار دَور

سنہ ۱۹۱۰ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک بمبئی میں متعدد اُردو اخبارات نکلے، لیکن ان کی فہرست طوالت سے خالی نہیں، ان کے فائل بھی سامنے نہیں ہیں، اس لیے صحت اور جامعیت کے ساتھ رائے زنی نہیں کی جاسکتی۔

لہٰذا اس نئے دور کا آغاز سنہ ۱۹۲۰ء سے کیا جاتا ہی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تحریکِ خلافت شباب پر تھی؛ علی برادران مسلم ہندستان کے نہ صرف مسلم ہندستان کے بلکہ سارے ہندستان کے ہیرو بنے ہوئے تھے۔ مولانا شوکت علی مرحوم و مغفور نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بمبئی کو بنایا۔ جمعیتِ مرکزیہ خلافت کا صدر دفتر بمبئی میں قائم کیا۔ اس طرح بمبئی مسلمانانِ ہند کی سیاسیات اور عملی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ یہاں علمائے کرام آتے تھے اور وعظ کہتے تھے، رہنمایانِ عظام تشریف فرما ہوتے تھے اور تقریریں کرتے تھے، خطبائے عصر جلوہ افروز ہوتے تھے اور آتش بیانی اور شعلہ مقالی سے دِلوں کو گرماتے تھے، جلوس نکلتے تھے، جلسے ہوتے تھے، کانفرنسیں منعقد ہوتی تھیں۔ تحریکِ خلافت کی اہمیت سے مسلمانانِ بمبئی اور مسلمانانِ ہند کو روشناس کرنے کے لیے جمعیتِ خلافت کو ایک آرگن کی ضرورت تھی، چناں چہ پہلے ہفتے وار 'خلافتِ عثمانیہ' اور بعد میں روزنامہ 'خلافت' کے نام سے ایک بلند پایہ اخبار کی اشاعت شروع کردی گئی۔ غرض تقریروں سے، جلسوں سے، کانفرنسوں سے اور اخبارِ 'خلافت' کے اجرا سے بمبئی میں اُردو کی نشوونما کو غیرارادی طور پر بہت زیادہ مدد ملی۔

مولانا شوکت علی کی سیاسی خدمات سے قطع نظر ان کی ایک یہ زبردست خدمت بھی کبھی فراموش نہیں ہوسکتی کہ صوبۂ بمبئی میں ان کے قیام، جمعیتِ خلافت کے استحکام اور اخبار 'خلافت' کے اجرا سے اُردو زبان کو پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کا نادر موقع ملا۔ اُردو کے خادم مولانا شوکت علی کی اس اہم خدمت کو کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔

بمبئی میں 'خلافت' سے پہلے کی اُردو صحافت، عالمِ طفلی میں زندگی بسر کررہی تھی، 'خلافت' کے اجرا کے بعد بمبئی والوں کو یہ معلوم ہوا، کہ اُردو زبان میں ایک بلند پایہ اخبار بھی نکل سکتا ہی۔ 'خلافت'، بمبئی کا

سب سے پہلا اُردو اخبار ہے، جس نے نہایت بہترین سیاسی لٹریچر پیش کیا۔ اور مجلسِ خلافت بمبئی کا وہ پہلا ادارہ ہے جس نے بہت سی کتابیں اُردو کی چھاپیں اور شائع کیں۔

اُردو صحافت کے لیے سب سے پہلے 'خلافت' ہی نے میدان ہموار کیا، فضا پیدا کی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اور اخبارات بھی شائع ہونے لگے۔ اب حالت یہ ہے کہ ایک درجن کے قریب روزانہ اور پچاس کے قریب ہفتے وار اخبارات بمبئی سے نکل رہے ہیں۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ بمبئی کے اُردو اخبارات نے سب سے پہلے ہندستان کی مسلم اُردو صحافت میں انقلاب انگیز اقدام کیا۔ اب بھی دہلی، لکھنؤ، لاہور وغیرہ کے متعدد مقتدر مسلم روزنامے ایسے ہیں، جو ہر روز مقامی انگریزی اخبارات سے باسی خبریں ترجمہ کرتے ہیں، یا ریڈیو کی سُنی سُنائی خبروں کو اپنے الفاظ میں لکھ دیتے ہیں۔ لیکن یہاں کے تقریباً تمام اُردو روزنامے رائٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس کی مفصّل نیوز سروس لیتے ہیں اور ٹیلی پرنٹر بھی استعمال کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے رائٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس کو سارے ہندستان کے مسلم پریس سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی ہوگی جتنی صرف بمبئی سے ہوتی ہے۔

اس انقلاب انگیز اقدام کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں کے اخبارات خبروں کے اعتبار سے 'ٹائمز آف انڈیا' اور دوسرے بلند پایہ انگریزی، مرہٹی اور گجراتی اخبارات سے ہرگز فرومایہ نہیں ہیں۔ اس اقدام کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ اخبارات کی اشاعت پر بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ ان کی حیثیت اور عظمت مسلّم ہوگئی ہے۔ چناں چہ مناسب نرخوں پر اُنھیں اشتہارات بھی بہت کافی ملنے لگے ہیں، اور اس طرح ان کی مالی حالت پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط اور مستحکم ہوگئی ہے۔

اس وقت بمبئی سے حسبِ ذیل روزنامے نکلتے ہیں:-

(۱) روزنامۂ 'خلافت'
(۲) روزنامۂ 'انقلاب'
(۳) روزنامۂ 'اقبال'
(۴) ″ 'ہلال'
(۵) روزنامۂ 'اجمل'
(۶) ″ 'ہندستان'
(۷) ″ 'مسلم'
(۸) ″ 'الہلال'

(۹) روزنامۂ 'معاشرت' (۱۱) روزنامۂ 'بیدار'

(۱۰) " 'الکمال'

ان میں سے آخرالذکر چار اخبارات کے علاوہ سب رائٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس کی سروس لیتے ہیں۔

ہفتے وار اخبارات کم وبیش ۵۰ نکلتے ہیں۔ جس طرح یہاں کے روزنامے، شمالی ہند کے روزناموں کا مقابلہ اپنی خوبیٔ تحریر، فراہمیٔ اخبار اور معیارِ صحافت کے اعتبار سے کرسکتے ہیں، یہاں کے ہفتے وار اخبارات شمالی ہند کے ہفتہ واروں کے مقابلے میں نسبتاً پست ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخبارات ضرورت سے زیادہ نکل رہے ہیں۔

ان اخبارات میں سب سے پہلا درجہ 'قومی جنگ' کا ہے۔ یہ ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کا اُردوٗ ترجمان ہے۔ یہ اخبار اپنے مقالات، ترتیب، زبان وبیان اور معیار کے لحاظ سے ہندستان کے بہترین اخبارات کا ہم پلہ ہے۔

دوسرے ہفتے وار اخبارات زیادہ تر ادبی یا فلمی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں

(۱) 'صداقت' (۶) 'جمہور'

(۲) 'مصوّر' (۷) 'سروش'

(۳) 'نظام' (۸) 'ظفر'

(۴) 'اجمل ویکلی' (۹) 'حشر'

(۵) 'ہندستان ویکلی' (۱۰) 'ناخدا'

خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مذکورہ اخبارات کے مالک یا مدیر بیرونِ بمبئی کے ہیں۔ 'ناخدا' کے مالک و مدیر خاص بمبئی کے ہیں، یہ اخبار کوکنی قوم کا آرگن ہے۔ اسی طرح 'اجمل' ڈیلی کے مالک و مدیر حارث صاحب بھی کوکنی ہیں۔ ان کا اخبار بھی اُردوٗ کی بڑی خدمت کر رہا ہے۔

بمبئی سے کئی ماہ نامے بھی شائع ہوتے ہیں:۔

(۱) 'صبحِ امید' (۲) 'تنویر'

(۳) 'تمثیل' ۔۔۔ (۵) 'ایشیا'

(۴) 'ہندستان'

ان میں سے 'تمثیل' تو خالص فلمی پرچہ ہے۔ باقی پرچے علمی ادبی ہیں، اور بلند معیار کے حامل ہیں۔ 'صبحِ اُمید' کے مالک و مدیر مسٹر عبدالحمید بوبیرے بھی کوکنی ہیں۔ انھوں نے یہ رسالہ نکال کر اپنی قوم میں اُردو زبان کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ 'تنویر' کی مدیرہ ایک خاتون، محترمہ اصغری بیگم ہیں، یہ پرچہ بھی بلند معیار کا حامل ہے۔ جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھپوری، مجنوںؔ گورکھپوری جیسے شاعر و ادیب اس کے قلمی معاونین میں شامل ہیں۔ 'ایشیا' مشہور شاعر ساغرؔ نظامی کا پرچہ ہے۔ پہلے میرٹھ سے نکلتا تھا، پھر پونہ سے اس کی اشاعت شروع ہوئی، اب بمبئی سے نکل رہا ہے۔

غرض ماضی کی روشنی میں اگر حال کا اندازہ لگایا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ بمبئی کی اُردو صحافت اس وقت پنجاب اور یوپی کی اُردو صحافت سے ہرگز پیچھے نہیں ہے، ممکن ہے دو قدم آگے ہو۔ یہاں اُردو زبان جڑ پکڑ چکی ہے اور اگر اسی رفتار سے یہاں اُردو کی خدمت کا سلسلہ جاری رہا، تو بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ دہلی، لاہور، لکھنؤ کی طرح بمبئی بھی اُردو زبان کا مرکز تسلیم کرلیا جائے گا۔ بنگال اور مدراس میں اُردو اب تک اجنبی ہے، لیکن بمبئی نے اسے اپنا لیا۔

بمبئی میں اُردو صحافت کے عہد بہ عہد کے عروج و ارتقا پر اگر ایک نظر ڈالی جائے، اس کے ماضی سے حال کا مقابلہ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہاں اُردو صحافت کا مستقبل نہایت خوش گوار اور خوش آیند ہے۔

اس وقت جنگ کی دشواریوں کے باعث اخبارات کے اجرا اور اشاعت پر گوناگوں پابندیاں عائد ہیں۔ لیکن جب یہ جنگ ختم ہوگی، اور یہ پابندیاں دُور ہوں گی، تو یقیناً ایک نئے اور شان دار دَور کا آغاز ہوگا جس کی ہلکی سی جھلک موجودہ اُردو صحافت کی ترقیوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

یقیناً وہ دَور جلد آئے گا، جب یہاں کے اخبارات کا معیار اور زیادہ بلند ہوجائے گا، جب یہاں کے رسائل کی خدمت کا دائرہ کچھ اور زیادہ وسیع ہوجائے گا، خدا کرے وہ دَور جلد شروع ہو!۔

-:(*):-

مولانا شاہ نیاز احمد صاحبؒ بحیثیت شاعر

(جناب خلیق احمد صاحب نظامی ام۔اے)

مولانا شاہ نیاز احمد صاحبؒ اٹھارویں صدی کے نہایت عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ علم وفضل میں یکتائے عصر تھے۔ زہد و اتقا کا دُور دُور شہرہ تھا۔ بریلی میں اُن کی خانقاہ تھی۔ ہزاروں عقیدت مندوں کا وہاں ہجوم لگا رہتا تھا۔ تشنگانِ معرفت اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لیے دُور دُور سے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ غلام سرور کا بیان ہے:-

"خلق بے شمار بحلقۂ ارادت وی درآمد و مردماں از اقالیم دُور و دراز یعنی از کابل و قندھار و شیراز و بدخشاں بخدمتِ بابرکت وی حاضر آمدہ مستفید و مستفیض شدند"

خود شاہ صاحبؒ کا عالم یہ تھا کہ عشقِ حقیقی کے نشے میں چوُر رہتے تھے۔ دردِ عشق ان کا سرمایۂ حیات تھا۔ یہ آگ ہر وقت اُن کے سینے میں سلگتی تھی۔ کبھی کبھی اُس کے شرارے شعر کی صورت میں نمودار ہوتے تھے۔ وہ شعر بہت کم کہتے تھے لیکن جب کبھی کہتے تھے، اپنا دِل نکال کر رکھ دیتے تھے۔ اِن کے لفظ لفظ سے اثر ٹپکتا تھا۔ اُن کا شعر اعماقِ روح سے نکلتا اور سُننے والے کے دِل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کا کلام اس زمانے کے صوفیا میں بہت مقبول ہوا۔ صاحبِ خزینۃ الاصفیا نے لکھا ہے:-

"حضرت شاہ دِل آگاہ بہ شعر رغبت تمام داشت و اشعارِ آب دار متضمن حقائق و معارف گفتہ۔ چناں چہ دیوان نیاز کہ از تصانیف آں حضرت است بسیار مرغوب و مطبوعِ طبع جماعتِ اصفیاست"

اس مضمون میں اُن کے اُردو دیوان پر ایک نظر ڈالنی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ضرور لحاظِ خاطر رکھنی چاہیے کہ شاہ صاحب کا اصل موضوع عشقِ حقیقی ہے۔ ایک فن کار کی حیثیت سے اُن کے کلام پر تنقید کرنا اُصولی غلطی ہوگی۔ حالاں کہ یہ حقیقت ہے کہ اس اعتبار سے بھی شاہ صاحب کسی سے پیچھے نہیں۔

مختصر حالات | شاہ نیاز احمد صاحب ۱۱۴۲ھ میں بہ مقامِ سرہند پیدا ہوئے۔ والدِ ماجد حاجی حکیم

شاہ رحمت صاحب کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا۔ آپ کی والدۂ ماجدہ نے آپ کی پرورش کی اور تعلیم و تربیت کا نہایت عمدہ انتظام کیا۔ جب سرہند کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو دہلی میں مولانا شاہ فخرالدین صاحب کی خدمتِ بابرکت میں علومِ ظاہری کی تکمیل کے لیے حاضر ہوئے۔ شاہ نیاز احمد صاحب نہایت ذکی اور ذہین انسان تھے۔ ۱۷ سال کی عمر میں معقول و منقول، فروع و اصول، حدیث و تفسیر میں کمال حاصل کرلیا۔ علومِ ظاہری سے فراغت ہوئی تو شاہ فخرالدین صاحب دہلوی کے دستِ مبارک پر بیعت کرلی اور علومِ باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۹ سال تھی۔ آپ کی لیاقت، استعداد اور سعیٔ پیہم سے پیر بہت متاثر ہوئے اور اپنا خلیفۂ راستیں مقرر کیا۔ بریلی میں اقامت کی ہدایت فرمائی۔ بریلی پہنچ کر شاہ نیاز احمد صاحب نے اپنی خانقاہ قائم کی، جو بہت جلد، بہ قول غلام سرور "معدنِ فیوضِ ربّانی" اور "مطلعِ انوارِ سبحانی" بن گئی۔ جگہ جگہ سے لوگ آپ کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اٹھارویں صدی میں چشتیہ نظامیہ سلسلے کو ہندستان میں جو کچھ فروغ ہوا، وہ مولانا شاہ فخرالدین صاحب دہلوی کے دو مریدوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ شاہ نور محمد صاحب نے پنجاب میں اور شاہ نیاز احمد صاحب نے یوپی میں اپنے سلسلے کو خوب پروان چڑھایا۔ شاہ نیاز احمد صاحب نے سنہ ۱۲۵۰ھ میں بہ مقامِ بریلی وصال فرمایا۔

بہ حیثیتِ شاعر

شاہ صاحبؒ کو سوز و گداز سے بھری ہوئی طبیعت ودیعت کی گئی تھی۔ عشق ان کے خمیر میں تھا۔ جذباتِ عشق و محبت کبھی کبھی شعر کی صورت اختیار کرلیتے تھے۔ شاہ صاحبؒ شعر بہت کم کہتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن کے اُردو اور فارسی دونوں دیوان بہت مختصر ہیں لیکن جو کچھ بھی ہے، وہ اپنی جامعیت اور افادیت میں کم نہیں۔ اُن کی فکرِ رسا نے تصوّف کے نہایت باریک نکات کو انتہائی حُسن اور دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اُن کے کلام میں آورد نہیں۔ وہ قلبی واردات کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ سوز و گداز، درد، علوِ معانی کے علاوہ نفاست، سلاست اور روانی اُن کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ حضرتِ نیاز نے فکرِ رسا پائی تھی۔ اور اس پر خود حضرتِ نیاز کو ناز تھا۔ اکثر اشعار میں اُس کا ذکر کرتے ہیں ؎

رکھتے ہیں نیاز یہ اہلِ دِل ترے شعر سُننے کا اشتیاق
غزل ایک دوسری اور کہہ تجھے حق نے فکرِ رسا دیا

ایک دوسرے شعر میں کہتے ہیں ؎

ہوں میں نیاز مند جناب امیر کا ۔۔۔ اس واسطے میں صاحب فکرِ رسا ہوا

ایک جگہ اپنی فصیح البیانی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

بھلا اک غزل اور بھی ایسی کہیو ۔۔۔ تجھے میں فصیح البیاں دیکھتا ہوں

۱۔ سلاست اور روانی سلاست اور روانی حضرتِ نیاز کے کلام کے خاص جوہر ہیں ۔ وہ نہایت بلند خیالات کو انتہائی سادگی، نفاست اور دِل کشی کے ساتھ ادا کرتے ہیں ۔ اس سادگی میں ادبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے ۔ اُن کے یہاں آمد ہی آمد ہے' آورد کا نام نہیں ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

؎ رواں آنکھوں سے ہے سیلاب گُل گوں ۔۔۔ الٰہی چشم ہے یا چشمۂ خوں

؎ ایک تو ہی نہیں میں بھی ہوں اُن آنکھوں کا مارا
ای اہلِ نظر نرگسِ بیمار سے کہہ دو

؎ کروں کیا بیان میں ہم نشیں اثر اُس کے لطفِ نگاہ کا
کہ تعینات کی قید سے مجھے ایک دم میں چھڑا دیا

؎ ۔فرشِ زمیں ہے خاک نشینوں کا بسترا ۔۔۔ بے خان و مانِ عشق کا تکیہ ہے خشت و سنگ

؎ مجھ سے مریض کو طبیب ہاتھ تو اپنا مت لگا ۔۔۔ اس کو خدا پہ چھوڑ دے بہرِ خدا جو ہو سو ہو

؎ غمِ جُدائی کو ہم جانے یا خدا جانے ۔۔۔ بلاکشوں پہ جو گُزری تری بلا جانے

بعض چھوٹی بحر کی غزلیں اپنی روانی، سادگی اور شگفتگی میں بے نظیر ہیں ؎

ستارے نہیں یہ شبِ تار کے ۔۔۔ شرارے ہیں آہِ شرر بار کے
مبارک رہے تجھ کو واعظ بہشت ۔۔۔ میاں ہم تو طالب ہیں دیدار کے
جو دیکھے تجھے بُلبل اور شکِ گُل ۔۔۔ نہ پھٹکے کبھی گِرد گُل زار کے

صفائی ترے سلکِ دنداں کی دیکھ ہوے غرقِ دریا گُہر ہار کے
عجب کیا جو تشریف لاؤ اِدھر عیادت کو آتے ہیں بیمار کے
کہاں فصلِ گُل ہو کہاں وہ بہار چلوہل کے رووین کلے خار کے

غزل اور ایسی ہی کہیو نیاز
کہ مشتاق ہیں تیرے اشعار کے

۲۔ تاثیر | عشقِ حقیقی شاہ صاحبؒ کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہو۔ اس لیے ہر لفظ جو اُن کی زبان سے نکلتا ہو، گرمی اور تاثیر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہو۔

ے مجھے بے خودی یہ تونے بھلی چاشنی چکھائی کسی آرزو کی دِل میں نہیں اب رہی سمائی
ے نہ مقامِ گفتگو ہو نہ محلِ جستجو ہو نہ وہاں حواس پہنچیں نہ خرد کو ہو رسائی
نہ کہیں ہو نی مکاں ہو نہ یں ہو نہ زماں ہو دلِ بے نوا نے میرے جہاں چھاؤنی ہو چھائی
نہ وصال ہو نہ ہجراں نہ سرور ہو نہ غم ہو جسے کہیے خوابِ غفلت سو وہ نیند ہم کو آئی

۳۔ مبلغِ علم | حضرتِ نیاز بڑے پایے کے عالم تھے۔ اُن کے اشعار سے تبحرِ علمی کا پتا چلتا ہو۔ فلسفہ، منطق وغیرہ میں کافی مہارت تھی۔ اس کی اصطلاحات اشعار میں استعمال کرتے ہیں :-

ے سمندِ ناز کی جب باگ اُس نے دی ٹک چھوڑ وہیں ٹھٹک رہے برہانِ سُلّمی منھ موڑ
ے جو خطِ جوہری ممکن نہیں حکیم کنے تو اوس کی دیکھ کر کیا کرے گا توڑ اور جوڑ
ے ترے آئینۂ رُخ کا صفا دیکھ تحیّر میں ہو اشراقِ افلاطون
ے کیا طرفہ اجتماعِ نقیضین ہو حکیم آنکھوں کے وہ لڑانے میں رکھتا ہو صلح و جنگ

بعض اشعار میں آیاتِ قرآنی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً ے

نکتہ اَیْنَمَا سے واقف ہو چہرۂ یار جا بجا دیکھا

۴۔ مشکل زمین میں اشعار | حضرت نیاز کو زبان پر بڑی قدرت ہو۔ وہ نہایت سنگلاخ زمین میں

بہت بے تکلف شعر کہتے ہیں۔ اور کمال یہ ہی کہ ان اشعار میں بھی آورد کا شبہ نہیں ہوتا۔ ایک غزل کا مطلع ہی ؎

لشکرِ غم آپڑا اقلیمِ دل پر ٹوٹ ٹوٹ یہاں ندائے الاماں تھی واں صدائے لُٹ لُٹ

اس زمین میں تقریباً ۲۸ شعر کہے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

چشمِ بد سے دور رہیو کیا ہی آب و تاب ہی ہوں گی یہ آنکھیں بنائی موتیوں سے کوٹ کوٹ
دیکھ میرا خونِ اشک اس نے کہا شب مجھ کو دیکھ تیری آنکھوں میں گئی میری حنا سب چھوٹ چھوٹ

ایک دوسری غزل کا مطلع ہی ؎

دھیان اپنے کو نہ خاک نہ افلاک سے باندھے عرفان اگر چاہے دلِ پاک سے باندھے

اس غزل کا ایک بہت رواں اور پُرتاثیر شعر ہی ؎

اس چرخ سے کیا رکھیے بھلا چشمِ نکوئی جو بیر پس از مرگ بھی ہی خاک سے باندھے

۵۔ محاورات و روزمرہ بعض اشعار میں روزمرہ اور محاورات نہایت صفائی اور سلاست سے باندھے ہیں۔ روزمرہ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

سینے میں قلزم کو لے قطرے کا قطرہ رہا بل بے سمائی تری اُف رے سمندر کے چور
؎ اِدھر کی نہیں جانتے رسم و راہ میاں ہم تو باشندے ہیں پار کے

۶۔ متروکات وغیرہ نیاز صاحب بعض جگہ وہ الفاظ و محاورات لکھتے ہیں جن کا استعمال اب متروک ہی۔ مثلاً "ٹک"، "کنے" وغیرہ۔

شاہ صاحب کی چند لغزشیں یہ ہیں:۔

"جنگ نہ ہوتا" ــــــ جنگ مذکر استعمال نہیں ہوتا۔

"ہاتھوں کے مور اُڑنا" ــــــ صحیح محاورہ "ہاتھوں کے توتے اُڑنا" ہی۔

؎ جب دل میں کھنچا نیاز کے تجھ حسن کا نقشہ ــــــ "تیرے حسن کا" ہونا چاہیے۔

؎ زرا چھپ نگاہ رقیب سے پڑی اس گلی میں تھی مری خاک ــــــ "ذرا چھپ کر" ہونا چاہیے۔

شاہ صاحب "دیکھنے والو" کے لیے " دیکھنے ہارو"، "مٹی کی جگہ "ماٹی" اور "کدھر" کو " کیدھر" لکھتے ہیں۔

۷. عشق ومعرفت شاہ نیاز احمد صاحب صوفی تھے۔ عشقِ الٰہی اُن کے خمیر میں تھا۔ وہ عشق کے بندے تھے۔ عشق کی دُنیا میں رہتے تھے۔ عارفِ رومؒ کی طرح اُن کے قلب کی دھڑکنوں میں یہ آواز پوشیدہ تھی ؎

شادباش ای عشق خوش سودائے ما ای طبیبِ جملہ علت ہائے ما

عشق کے اُن پر اتنے احسان ہیں کہ کہتے ہیں ؎

کہاں تک کہوں لطف واحسانِ عشق کہ جوں جوں گھٹا مَیں بڑھایا مجھے
یہاں تک دیا مجھ کو حسنِ عروج کہ بندے سے مولا بنایا مجھے

عشق کی دُنیا میں پہنچ کر وہ عقل وہوش کو الوداع کہتے ہیں ؎

جونہیں آمد آمدِ عشق کا مجھے دِل نے مژدہ سُنادیا خرد و حواس و شکیب نے وہیں کوس کوچ بجادیا

ایک دُوسرا شعر ہے ؎

جب بردرِ دِل حضرتِ عشق آن پکارے گوشے ہوئی عقل اور ہوے اوسان کنارے

جب شاہ فخرالدین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ؎

جبھی جا کے مکتبِ عشق میں سبقِ مقامِ فنا لیا جو کچھ لکھا پڑھا تھا نیاز نے سو وہ صاف دل سے بُھلا دیا

علومِ ظاہری کو خیرباد کہہ کر وہ اس شان سے عشق کے میدان میں قدم رکھتے ہیں ؎

عشق کے میدان میں آصورتِ انسان بنا عاشقِ مولا ہوا چاند کا جیسے چکور

جذباتِ عشق اُن کے سینے میں متلاطم ہوتے ہیں۔ بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں ؎

جوش زن ہے عشق کی مے اب خُمِ دل میں نیاز گہ اُبل کر وہ گرے گہ خُم سے نکلے پھوٹ پھوٹ

ایک جگہ کہتے ہیں ؎

کیا جوش میں ہے اب مےِ وحدت خمِ دل میں اُبلے ہے پڑی رومی و عطار سے کہہ دو

آتشِ عشق اُن کے سینے کو جلا دیتی ہے ؎

کہیں عاشق نیاز کی صورت سینہ بریاں و دِل جلا دیکھا

طوفانِ اشک اُمنڈتا ہے۔ بے اختیار نیاز کے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھتے ہیں ؎

یا الٰہی ذوقِ گردوں سنبھال بے طرح اُمڈا ہے یہ طوفانِ اشک

ایک لمحہ رُکتا ہے۔ سوچتا ہے کہ اشکوں نے حقیقتاً اُس کی یاوری کی ہے ؎

پھُک چکے تھے ہم تو اے یارو ابھی گر نہ ہوتا اس گھڑی احسانِ اشک

عشق نے شاہ صاحب کی شاعری میں ایک درد، سوز اور گرمی پیدا کردی ہے۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ محسوس بھی کرتے ہیں اس لیے اس کی آتش انگیزی بھی بے پناہ ہوتی ہے۔

۸۔ وحدت الوجود مختصر طور پر وحدت الوجود کا نظریہ یہ ہے۔ خدا کے سوا کوئی چیز کائنات میں موجود ہی نہیں۔ یا یہ کہ جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی ہے۔ اسی کو ہمہ اوست کہتے ہیں۔ اہلِ ظاہر کے نزدیک خدا سلسلۂ کائنات سے بالکل الگ ایک جداگانہ ذات ہے۔ صوفیا کے نزدیک خدا سلسلۂ کائنات سے الگ نہیں ؎

با وحدتِ حق زکثرتِ خلق چہ باک صد جائے اگر گرہ زنی رشتہ یکیست

دھاگے میں جو گرہیں لگادی جاتی ہیں اُن کا وجود اگرچہ دھاگے سے متمائز نظر آتا ہے لیکن فی الواقع دھاگے کے سوا، گرہ کوئی زائد چیز نہیں۔ صرف صورت بدل گئی ہے۔

اٹھارویں صدی میں شاہ نیاز احمد صاحب نے اس نظریے کو بہت پھیلایا۔ انھوں نے اکثر اشعار اسی عقیدے کی تشریح میں لکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وحدت الوجود ہی ان کا اصلی موضوع ہے اور اسی سے اُن کا کلام لبریز ہے۔

اس سلسلے کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وحدت کے ہیں یہ جلوے نقش و نگار کثرت گر سترِ معرفت کو پاوے شعور تیرا
معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا از ماہ تا بہ ماہی سب ہے ظہور تیرا

؎ عالم کہے جس کو جہاں یعنی جہانِ جسم وجاں — شامل ہیں سب اُس ذات کی جس کو کہے منسار ایک
بے امتیازِ بیش وکم دانے میں ہیں یہ سب بہم — بیخ و درخت و شاخ و گُل انبوہ برگ و بار ایک
طوطی ہو جب دستاں سرا سو سو طرح سے دے نوا — ہردم نئی بولے صدا اور ہو وہاں منقار ایک

؎ نیرنگیوں سے یار کی حیراں نہ ہوجیو — ہر رنگ میں اُسی کو نمودار دیکھنا

؎ جسے ذاتِ بے رنگ و بےچوں کہیں ہیں — بہ ہر رنگ جلوہ کُناں دیکھتا ہوں

؎ صورتِ گُل میں کِھل کھلا کے ہنسا — شکلِ بلبل میں چہچہا دیکھا
شمع ہوکر کے اور پروانہ — آپ میں آپ کو جلا دیکھا
کرکے دعوا کہیں اناالحق کا — برسرِ دار وہ کھنچا دیکھا

کائنات اُن کے نزدیک ایک بحرِ رواں ہے ــــ مسلسل اور متواتر ــــ

؎ اگر کوئی جانے جہاں غیرِ حق ہے — سو میں اُس کو دھوکا گماں دیکھتا ہوں
یہ جو کچھ کہ پیدا ہے سب عینِ حق ہے — کہ اک بحرِ ہستی رواں دیکھتا ہوں

؎ ازل سے لے کے ابد تک وہی جو ہے سو ہے — بہ رنگِ بحرِ رواں جس میں ہے نہ جزر نہ مد

اسی مسئلے کو ریاضی سے بھی ثابت کرتے ہیں۔ جو رشتہ ایک (مبتدا الاعداد) اور دوسرے عددوں میں ہے وہی رشتہ خدا اور کائنات کے درمیان ہے ــــ

؎ تعینات کے نقطوں سے ہے کثیر احد — وہی ہے ایک یہ دس سو ہزار لاکھ کروڑ

؎ ہیں دیدۂ بینا میں ہم سارے کم و بسیار ایک — کثرت نمایاں اتنی ہو جتنا کرے تکرار ایک

۹۔ وحدتِ ادیان

شاہ نیاز احمد صاحب وحدتِ ادیان کے قائل تھے۔ اُن کی حریتِ فکر وضمیر کا یہ عالم ہے۔ کہتے ہیں ــــ

؎ یہ سب ادیان و ملل ہیں شاخ ہائے یک درخت — ایک جڑ سے ہیں یہ نکلی ڈالیاں سب پھوٹ پھوٹ

؎ صنم کو پوجے برہمن حرم کو مانے شیخ — یہ دونوں ایک ہیں مانوں کسے کسے دوں چھوڑ

؎ گر بادۂ توحید پئیں اہلِ مشارب — ہفتاد و دو ملت کی ہو تکرار فراموش

؎ جو رب الحرم ہی صنم بھی وہی ہی | حرم دیر میں ایکساں دیکھتا ہوں
اسے برہمن اور اُسے شیخ مانے | یہ آپس کا جھگڑا یہاں دیکھتا ہوں

۱۰- تراجم شاہ صاحب نے فارسی اشعار سے تراجم بھی بہ کثرت کیے ہیں۔ بعض جگہ تو وہ فارسی شعر کا صاف ترجمہ کر دیتے ہیں۔ اور بعض جگہ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ فارسی شعر ذہن میں رکھ کر شعر کہا ہی۔ بعض غزلوں کے خیالات اور زمین فارسی اشعار سے لی گئی ہی۔ مثلاً "جو ہو سو ہو" والی غزل حافظ کی مشہور غزل "ہرچہ بادا باد" کا اثر معلوم ہوتی ہی۔ ایک دوسری غزل جس کا مطلع یہ ہی ؎

سرزمینِ چشت کی آب و ہوا کچھ اور ہی | دین و دنیا سے نرالا اور ہی کچھ طور ہی

احمد جامؒ کی مشہور غزل ؎

عاشقانِ خواجگانِ چشت را | از قدم تا سر نشانے دیگر است

کے طرز پر لکھی گئی ہی۔

چند اشعار جو فارسی اشعار کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں ملاحظہ ہوں ــــــــ

؎ اسرارِ حقیقت کے خبردار جو ہوتے | ہفتاد دو ملت میں کبھی جنگ نہ ہوتا

حافظ کا شعر ہی ؎

جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ | چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

؎ کافرِ عشق ہوں میں بندۂ اسلام نہیں | بُت پرستی کے سوا اور مجھے کام نہیں

خسرو کا شعر ہی ؎

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست | ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنّار نیست

ع کل دورۂ مجنوں تھا نیاز آج ہی اپنا

مشہور مصرع ہی۔ ع دورِ مجنوں گزشت و نوبتِ ما است

ع پوچھو نہ مجھ خراب سے اصلاحِ کار تم

حافظ کا مصرع ہی۔ ع صلاحِ کار کجا و منِ خراب کجا

مریضِ عشق کا درماں عبث کرے ہی تو　　دوا ہماری ارسطو بھلا تو کیا جانے

معلوم ہوتا ہی کہ خسرو کا شعر سامنے تھا ؎

از سرِ بالینِ من برخیز ای ناداں طبیب　　دردمندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست

خاتمہ حقیقت یہ ہی کہ شاہ نیاز احمد صاحب اٹھارویں صدی میں سلسلۂ نظامیہ کے نہایت صاحب کمال، وسیع مشرب، صاحبِ دِل اور صاحبِ ذوق بزرگ تھے۔ علم وفضل میں یکتائے عصر تھے۔ عشقِ حقیقی میں ہر وقت ڈوبے رہتے تھے۔ اُن کے اشعار انھی جذباتِ عشق کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ اُن کے مزار پر جائیے تو آج بھی یہ آواز فضا میں سُنائی دے گی ؎

طمعِ فاتحہ از خلق نہ داریم نیاز　　عشقم اندر پسِ من فاتحہ خوانم باقی ست

اِمراءالقیس

(از جناب عبدالرحمان صاحب مستقیمی الاصلاحی)

نام و نسب اصلی نام جندح ہی۔ امرؤالقیس، الملک الفلیل اور ذوالقروح لقب ہی۔ ابوالحارث، ابووہب اور ابوزید کنیت ہی۔ باپ کی طرف سے نسب نامہ یہ ہی حجر بن حارث بن عمرو بن حجر۔ یہ لوگ مشہور شاہانِ کندہ سے ہیں۔ ماں کی طرف سے نسب نامہ حسب ذیل ہی: فاطمہ بنتِ ربیعہ بن حارث بن زہیر تغلبی۔ یہ ربیعہ زہیر تغلبی کے دونوں بیٹے کلیب اور مہلہل کی بہن ہی۔

علماے انساب اس نسب نامے پر متفق نہیں ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہی کہ اس کا نام جندح نہیں امراءالقیس ہی۔ کسی کے نزدیک اس کا نام صرف قیس ہی کوئی کہتا ہی کہ اس کے باپ کا نام عمرو ہی اور حجر غلط ہی اور اس کی ماں کا نام فاطمہ نہیں بلکہ "تملک" ہی، پھر امراءالقیس کے کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی اس سبب اس کی کنیت کا ثبوت نہیں ملتا۔ بعضوں نے کہا ہی کہ وہ لڑکیوں کو زندہ درگور کردیا کرتا تھا لہٰذا اس کے کوئی اولاد باقی نہ رہی۔ بعض لوگ کہتے ہیں اس کے ایک لڑکی تھی جس کا نام ہندہ تھا مگر کچھ لوگوں کا خیال ہی کہ یہ اس کی بہن تھی لیکن قرائن سے اس قول کی تائید نہیں ہوتی۔ بہرحال علماے ادب کے ایک گروہ کا خیال ہی کہ یہ اختلافات اس بات کی دلیل ہیں کہ اس شاعر کا سرے سے وجود ہی غلط ہی۔ اس کے تمام قصے فرضی اور اس کے اشعار سب کے سب بعد والوں کی ایجاد ہیں اور اس کے متعلق تمام کی تمام روایتیں موضوع اور بے بنیاد ہیں اس لیے اس کی تمام داستان ایک افسانے سے زیادہ نہیں۔

لیکن یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی کہ صرف ان اختلافات کی بنا پر ہم اس کے وجود ہی سے انکار کردیں۔ اگر اس کے تمام واقعات صرف افسانہ ہی ہوتے تو پھر علماے انساب کو اس قدر اختلافات کی ضرورت کیا تھی لہٰذا یہ اختلافات ہی دراصل اس کے وجود کی سب سے بڑی دلیل ہیں۔

تاریخ میں اکثر واقعات ایسے ملیں گے جن کے ساتھ حقیقت اور صداقت کا توازن بہت کم قائم رہ سکا

ہے جو واقعہ دنیا میں جس قدر زیادہ مقبول و مشہور ہوتا ہے اسی قدر افسانہ سرائی اسے اپنے حصارِ تخیل میں لے لیتی ہے لیکن پھر بھی بعض واقعات ایسے ملیں گے جن کے وجود کو بعد کی تحقیقات نے روشنی میں کھڑا کردیا ہے اور دنیا ان کے وجود کے ماننے پر مجبور ہوگئی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت ابوہریرہؓ ایک جلیل القدر صحابی ہیں لیکن زمانۂ اسلام اور اس کے پہلے خود ان کے اور ان کے والد کے نام میں بے شمار اختلافات ہیں چنانچہ بیسؔ نام ان کے اور پندرہ نام ان کے والد کے بتائے جاتے ہیں۔ پھر کیا ہم محض اس بنا پر ان کے وجود سے انکار کردیں۔ اسی طرح یونان کے مشہور شاعر ہومر کے بارے میں بے شمار اختلافات ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہومر اس کا لقب ہے لیکن اس کے معنیٰ اور اس کے ملقب ہونے کے اسباب میں مختلف اقوال ہیں۔

ماحول

قبل اس کے ہم امراءالقیس کی زندگی اور شعر و شاعری پر بحث کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے وطنی قومی ماحول اور ان عوامل سے بحث کریں جو اس کی زندگی اور شاعری پر اثرانداز ہوئیں حقیقت یہ ہے کہ انسان پر اس کے ماحول اور ملکی آب و ہوا کا بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ ناممکن ہے کہ ایک حساس طبیعت کے اندر اس کے گہرے نقوش نہ پڑیں۔ پھر ایک شاعر کا دماغ تو اس سے ضرور ہی متاثر ہوتا ہے وہ حقیقت میں جو کچھ کہتا ہے اس کی زبان نہیں بلکہ اس زمانے اور ملک کی زبان ہوتی ہے جس میں وہ اور اس کے خیالات و جذبات پل کر جوان ہوتے ہیں اس لیے جب اس کی شاعری کا مطالعہ کرنا ہو تو لازم ہے کہ اس کے سارے ماحول کا مطالعہ کیا جائے۔

نجد نجد وسطِ عرب حجاز اور یمن کے درمیان میں واقع ہے اس کی مغربی سطح ۵۰۰۰ قدم اور مشرقی سطح ۲۵۰۰ قدم اونچی ہے۔ اکثر حصے ریتیلی زمین کے ہیں اور کچھ برفانی ہیں۔ پہاڑی سلسلے بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں جن میں قبیلۂ طے کے دو مشہور پہاڑ اجا اور سلمیٰ ہیں۔ وہاں بہت سی ندیاں بھی بہتی رہتی ہیں جو سال کے اکثر ایام میں سرزمینِ نجد کو سیراب کرتی ہیں۔ سب سے بڑی وادی رمہ ہے جو قریب قریب تمام نجد میں پھیلی ہوئی ہے۔

نجد میں خالص عربی زبان اور بدوی اشعار ملیں گے جس میں عجمیت کا ذرا بھی شائبہ نہیں. ظہورِ اسلام کے بعد جب عجمیوں سے اختلاط شروع ہوا تو نجد ہی وہ جگہ ہی جہاں کی زبان بہت حد تک محفوظ تھی جبلِ عکاذ پر بسنے والوں کی زبان تو چوتھی صدی کے اخیر تک خالص رہی ۔

نجد کے شمال میں اجا اور سلما کے پہاڑوں میں طی کا خاندان پایا جاتا تھا اور نجد کے بلند خطوں میں بکر و تغلب کی آبادیاں تھیں ۔ وادئ رمہ کے شمال میں عنترہ اور اسی کا خاندان آباد تھا اور نجد کے مغربی حصّے میں ہوازن اور سلیم کے قبائل بستے تھے ۔

علمائے لغت نے جن افصح القبائل کا ذکر کیا ہی ان میں سے قیس، تمیم، اسد اور ہوازن کی بعض شاخیں ہیں جنھیں "علیاء ہوازن" کہتے ہیں ۔ انھی کے متعلق ابوزید کا قول ہی کہ "افصح النّاس ہوازن کی دو شاخیں اوپر اور نیچے بسنے والی ہیں ۔ نیچے کے بسنے والوں میں خاندانِ سعد بن بکر، جشم بن بکر اور نصر بن معاویہ ثقیف ہیں اور بلند حصّے میں بسنے والے اہلِ مدینہ اور ان کے اطراف و جوانب کے عرب ہیں لیکن یہ لوگ اہلِ سافل کی سی فصاحت نہیں رکھتے تھے ۔"

جس طرح نجد کے قبائل میں افصح النّاس پائے جاتے ہیں اسی طرح کچھ ایسے قبائل بھی ہیں جو خالص ہیں اور جن کا وطن خالص بلادِ عرب میں شمار کیا جاتا ہی ۔ ان میں بعض قبیلے "جمرات" کے نام سے مشہور ہیں ۔ ان لوگوں کو جمرات اس لیے کہا جاتا ہی کہ انھوں نے اس بات پر اتفاق کیا تھا کہ ان کا کوئی فرد کسی غیر قبیلے میں شامل نہ ہوگا اور نہ کسی غیر کو وہ اپنے میں شامل کریں گے ۔ اس قسم کے چار خاندان تھے ۔ بنو تمیم بن عامر بن صعصعہ، اولادِ حارث بن کعب، اولادِ ضبہ اور اولاد عبس بن بغیض ۔

کندہ

خاندانِ کندہ نجد میں حکومت کرتا تھا اور اس کے بادشاہ امراء القیس کے آباو اجداد تھے ۔ علمائے انساب کہتے ہیں کہ خاندانِ کندہ جنوبی عرب کے قحطانی لوگوں سے تعلّق رکھتا تھا ۔ مؤرخین اس بارے میں مختلف الرّاے ہیں کہ کندہ کا جنوب سے نجد کی طرف ہجرت کرنے کا سبب کیا ہی؟ چناں چہ بہتوں کی راے ہی کہ یہ قبیلہ جنوب کی طرف بحرین میں آباد تھا ۔ پھر وہاں سے ہجرت کرکے حضرموت میں آیا یہاں ان کی تعداد تقریباً تین ہزار تھی ۔ یہیں حضرموت کے ایک شہر کندہ میں مقیم ہو گئے اور اسی لیے پھر وہ اسی

شہر کے نام سے موسوم رہے۔ کچھ دنوں کے بعد وہاں سے مہرہ کے ایک قصبے دمون میں آباد ہوئے۔ یہ تمام آبادیاں ان کے بھائی حمیریوں کے زیر حکومت تھیں۔ حمیریوں نے اس خاندان کے رؤسا اور با اثر لوگوں کو امورِ سلطنت میں داخل کیا۔ جب حسان بن تبع حمیری کا زمانہ آیا تو کندیوں کی حیثیت میں چار چاند لگ گئے۔ ان کا سردار حجر بن عمرو تھا جو حسان کا بھائی ہوتا تھا چوں کہ یہ جنگ اور فتوحات میں حسان کا مددگار تھا اس لیے حسان نے ان مقامات اور قبائلِ معد بن عدنان پر اسے حاکم بنادیا۔ اور اس طرح خاندانِ کندہ میں ایک بادشاہ کا وجود ہوا۔

جب حجر بن عمر کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ اس کے بیٹے عمر بن حجر نے لی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا حارث حاکم ہوا جس کے زمانے میں یمن پر حبشہ کا تسلط ہوگیا اور حمیری حکومت ختم ہوگئی نیز کندہ سے بھی حمیریوں کی سیادت کا خاتمہ ہوگیا۔ اب حارث مستقل طور پر اپنی آبائی حکومت کا مالک بنا۔ عراق میں آلِ منذر کی حکومت تھی جس سے حارث کی ہمیشہ ٹکر رہا کرتی تھی اس وقت وہاں کا فرماں روا منذر بن سما تھا جو قباذ کے زیرِ حکومت مقرر ہوا تھا۔

اسی زمانے میں مزدکی مذہب کا ظہور ہوا جو اشتراکیت کے بہت کچھ مشابہ تھا۔ ایران کے بادشاہ قباذ نے اس مذہب کو قبول کیا اور منذر بن ماء السماء کو بھی اس مذہب کے اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اس نے یہ مشورہ ٹھکرا دیا اس پر قباذ برافروختہ ہوگیا اور اسے معزول کر کے اس کی جگہ حارث کو حاکم بنادیا۔ اس سے حارث کی عظمت میں اور اضافہ ہوگیا۔

مزدکیت کے ظہور کو ابھی زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ قباذ فوت اور اس کی جگہ نوشیرواں بادشاہ ہوگیا۔ زمامِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اس نے مزدکیت کا خاتمہ کردیا۔ اسی کے ساتھ حارث کو معزول اور منذر بن السما کو پھر حاکم بنادیا۔

حارث کا ایک لڑکا بنی اسد پر حکومت کرتا تھا۔ اس کے کئی لڑکے تھے جن میں بڑا لڑکا نافع اور چھوٹا ہمارا شاعر امراؤالقیس ہے۔

یہ کندی حکومت امراؤالقیس کے زمانے تک اصل قحطانی اور بدوی حکومت تھی۔ جس میں شہریت د

حضارت کے وہ آثار نہ تھے جو آلِ منذر اور آلِ غسان کی حکومتوں میں تھے لیکن یہ بدویت چند ہی دِنوں میں ختم ہوگئی۔ پہلے ان کا مذہب حمیری مذہب تھا مگر حیرہ کی حکومت ملتے ہی مزدکیت کو اختیار کرلیا۔ جب حیرہ کی حکومت ہاتھ سے نکل گئی تو وہ پھر اپنے پُرانے حمیری ماحول کی طرف لوٹے اور دوبارہ اپنا قدیمی مذہب اختیار کرلیا۔

مہلہل امراءالقیس کا ایک ماموں مہلہل تھا جس کا نام عدی ہے وہ شاعر اور بہادر تھا مہلہل لقب اس لیے پڑا کہ یہ پہلا شاعر ہے جس نے طول طویل قصائد کہے اس کے پہلے چھوٹے چھوٹے قطعات اور متفرق اشعار کہے جاتے تھے۔

امامِ ادب جاحظ کتاب الحیوان میں لکھتے ہیں " حقیقی شعر کی عمر بہت کم ہے سب سے پہلے جس نے شعر کہا اور شاعری کا راستہ صاف کیا وہ امراءالقیس اور مہلہل ابن ربیعہ ہیں۔"

لیکن فرزدق کہتا ہے۔ " ومھلھل الشعراء ذاک الاول۔ مہلہل سب سے پہلا شعر کہنے والا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مہلہل بن ربیعہ کو آدم الشعرا کسی طرح نہیں کہا جاسکتا۔ کیوں کہ اس زمانے کی عربی شاعری اس قدر کمال کو پہنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ یہ کسی طرح بھی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ کہ یہ اسی صدی کی ساختہ پرداختہ ہے ایک مصری فاضل سلیمان البتانی اپنی کتاب " الیاذہ " کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

> " مہلہل، شنفری، تابط شرا اور دیگر شعرا جو چھٹی صدی عیسوی کے اوائل میں شمار کیے جاتے ہیں اس قدر فصیح و بلیغ اشعار کہتے ہیں کہ شعرائے عرب کے مقدمۃ الجیش قرار نہیں دیے جاسکتے۔" ص ۱۰۸ و ۱۱۲

لیکن جب کہ اشعارِ جاہلیت کی تدوین باقاعدہ طور پر آٹھویں صدی عیسوی میں ہوئی اس وقت صرف دو ڈھائی سو برس پہلے یعنی ۵۰۰ء صدی عیسوی کے بعد کا کلام راویوں کو یاد تھا۔ اس حیثیت سے عربی ادب کی ابتدا ۵۰۰ء سے قائم کی جاسکتی ہے اور اس صورت میں البتہ مہلہل کو ہم عربی شاعری کا آدم الشعرا کہہ سکتے ہیں کیوں کہ اس کے پہلے کسی شاعر کا کلام ہم تک نہیں پہنچا۔

اس کے متعلق جہاں تک ہمیں معلوم ہے بہت آزاد خیال اور رند مشرب آدمی تھا وہ مذہبی قید و بند سے قطعی آزاد اور شرابی تھا وہ جو کچھ کرتا علانیہ کرتا۔ اپنے بھائی کلیب کی زندگی میں برابر قبیلوں کی عورتوں سے

چھیڑ چھاڑ کرنا، عیش ونشاط، شراب وکباب اور مختلف کیفیاتِ زندگی کے ترانے گاتا اور اپنے اشعار کے ذریعے اپنی دِلی کیفیات کا اظہار کرتا۔ جنگِ بسوس کے چھڑ جانے سے اس کی حالت میں تھوڑا بہت تغیّر ہوگیا اور اس طرح دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ جنگ کے بعد حارث اور اس کا لڑکا شرجیل بکر کے بادشاہ بن بیٹھے اور اس کا دوسرا لڑکا سلمہ تغلب کا حاکم بن گیا۔ اس طرح اس حکومت نے ان دونوں کے تعلقات پھر استوار کردیے۔

بہ ہر حال امرا القیس نے ایک بدوی حکومت کے زیرِ سایہ تربیت پائی جو تمدّن وثقافت اور تعلیم وتعلّم سے قطعاً ناآشنا تھی۔ اس کا سرمایہ صرف وہ اشعار تھے جن میں عشق ومحبت کی داستانیں بیان کی گئی تھیں۔ اس نے تمام طرف سے توجہ ہٹا کر اسی کو اپنی زندگی کا مطمحِ نظر قرار دیا اور صرف شاعری اور عیاشی کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کردی اس کے سامنے جو شاعری تھی وہ دراصل اسی قسم کی تھی جس میں ہر قسم کے جذبات کو علانیہ بیان کیا جاتا تھا چناں چہ امرا القیس نے بھی اسی کو اپنا مددگار بنایا اور اس طرح ہر قسم کی بے باکیوں نے اس کے کلام میں جگہ حاصل کرلی۔

امرا القیس کا باپ بھی ایک جابر بادشاہ تھا جس نے کبھی رعیّت کی اصلاح کی طرف توجہ نہ دی۔ خراج کی آمدنیوں کو عیش وعشرت اور شہوت رانیوں میں صرف کیا کرتا کلیب بھی کچھ کم متکبّر نہ تھا اور مہلہل تو اپنے خاندان سے الگ ہوکر زندگی کے لطف اٹھا رہا تھا۔ اور اس کی شاعری عیش وطرب سے معمور شاعری تھی۔ انھی ماحول نے امرا القیس کے دماغ میں ہر قسم کی آزادی پیدا کردی۔ چناں چہ وہ بھی اپنے ماموں مہلہل کے نقشِ قدم پر چلنے لگا۔ اور تمام چیزوں میں اس نے بھی عیش وعشرت کو ترجیح دی۔ اپنے کلام میں حسنِ نسائی کی خوبیاں گِناتا۔ ان کے جمال کے وصف میں جدّتیں پیدا کرتا۔ کبھی عنیزہ سے محبت کی چھیڑ چھاڑ کرتا ہے تو کبھی امِّ حویرث اور امِّ رباب کی ہوس رانیوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ کبھی دار جلجل کی نہایت شہوت پرستانہ ساعت کو یاد کرتا ہے تو کبھی اپنی معشوقہ کے لیے اپنے اونٹ کی پُرلطف قربانی کا حال بیان کرتا ہے۔ کبھی پینے بیٹھتا ہے تو شعر کے جادو سے شراب میں کیف ورنگ بھر دیتا ہے اور کبھی شکار کی طرف نکل جاتا ہے تو گھوڑے اور آلاتِ صید کی تعریف میں فصاحت وبلاغت کے دریا بہا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اس نے اپنے

ماموں مہلہل سے میراث پائی تھی۔

معاصرین امراءالقیس فطرۃً شاعر اور شوخ مزاج تھا لیکن ماحول اور خاص کر اس کے عزیز و اقارب اور معاصرین نے اسے اور زیادہ شوخ اور رند خراباتی بنا دیا۔ وہ اپنے معاصرین میں جن شاعروں سے زیادہ متاثر ہوا ہے اس میں ایک تو مہلہل ہی ہے اور دوسرا شاعر ابوداؤد لایادی ہے۔ ابنِ رشیق نے لکھا ہے کہ امراءالقیس اپنی شاعری میں ہمیشہ اس سے سہارا لیتا تھا اور برابر اس کے اشعار کی روایت کرتا تھا چناں چہ بعض لوگوں نے امراءالقیس کو ابوداؤد کا راوی بتایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابوداؤد گھوڑے کی وصّافی میں ید طولا رکھتا تھا اور امراءالقیس کا اکثر کلام اس کے کلام سے متاثر ہوا ہے۔

یوں تو وہ اپنے معاصرین میں اور دوسروں سے بھی کچھ نہ کچھ متاثر ہوا ہے لیکن مہلہل اور ابوداؤد اس کے مربی اور معلّم کی حیثیت رکھتے ہیں اور انھی دونوں شاعروں کے رنگ اس کے کلام میں اکثر جگہ نمایاں ہیں۔ اس کے معاصرین میں سے عبید بن ابرص بھی ہے جو بنی اسد کا شاعر اور اس کے باپ کا ندیم ہے۔ توام یشکری۔ علقمۃ الفحل اور عمرو بن قمئیہ بھی اس کے معاصرین میں بڑا پایہ رکھتے ہیں لیکن ان میں زیادہ جس کے کلام نے اس پر اثر ڈالا وہ عبید بن ابرص ہے۔ چناں چہ اسلوب و معانی میں بعض جگہ ان دونوں کے اشعار متفق ہو جاتے ہیں۔

حالاتِ زندگی

امراءالقیس کے آباو اجداد کا تعلق خاندانِ کندہ سے تھا۔ یہ لوگ نجد میں قبائلِ معد بن عدنان پر حکومت کرتے تھے۔ اس کا زمانہ اسلام سے چالیس سال پہلے بتایا جاتا ہے۔ شروع زندگی کے حالات کا پتا نہیں اور نہ اس کے سنِ پیدائش کے متعلق قطعی طور پر کہا جاسکتا ہے۔ لیکن جہاں تک تحقیقات و جستجو کے بعد اس کے حالات فراہم ہوسکے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی ابتدائے سنِ شعور ہی سے آوارگی اور لاپروائی کی طرف مائل تھی پھر ماحول اور اس کے والدین کی ناعاقبت اندیشانہ روش سمندِ ناز پہ ایک اور تازیانہ ثابت ہوئی۔ چناں چہ جب اس نے شباب کے ہیجان انگیز میدان میں قدم رکھا تو پھر اس کا دماغ ہر قسم کی قید و بند سے آزاد ہو گیا۔ دراصل صحیفۂ زندگی کا یہی ایک ورق ہے جو اغراض و مقاصد، سود و زیاں اور نفع و نقصان کے نقوش

سے معرّا ہوتا ہو اس لیے سچ پوچھیے تو جذبات کے اظہار اور شاعری کا زمانہ بھی یہی ہو چناں چہ امرا القیس صہبائے شباب کی سرمستیوں میں اپنے والد اور معاملاتِ حکومت و سیادت سے کنارہ کش ہوگیا اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ اور اپنی تمام تر توجہ لہو و لعب، مجلسِ شراب و سرود، عورتوں کے حسن و عشق، سیر و شکار کی طرف مبذول کردی۔

قاعدے کے مطابق اس کے پاس اربابِ عیش و نشاط کا جمگھٹا ہونے لگا اور عرب کے اوباشوں کو ایک سردار بھی مل گیا۔ عیاشوں اور بدمعاشوں نے اس کی رفاقت اختیار کرلی۔ پھر کیا تھا قبائل کی لوٹ اور غارت گری شروع کردی۔ شراب پینے، شعر گانے اور بدمستی میں ہر قسم کی ناشایستہ حرکات کے مرتکب ہونے لگے۔ ان میں سے بعض شاعر بھی تھے جو اپنے اشعار امرا القیس کی جانب منسوب کرتے۔ لیکن نقادانِ سخن نے ان اشعار کا پتا چلالیا ہو اور انھیں الگ کر کے تبلا بھی دیا ہو۔ لیکن خود امرا القیس نے بہت سی ان کی خصوصیات کو اختیار کیا جس سے اس کے بعض طبعی رُجحانات کو صدمہ بھی پہنچا ہو۔

ابنِ کلبی کا بیان ہو کہ اس کے والد نے شعر گوئی کی وجہ سے اس کو گھر سے نکال دیا تھا اور اس سے نہ ملنے کی قسم کھالی تھی۔ لیکن ابنِ رشیق نے لکھا ہو کہ اس کے والد نے اس کو عشرت پسندی، مغازلہ اور ناؤنوشی کی وجہ سے الگ کردیا تھا کیوں کہ یہ چیزیں اصحابِ حکومت کے لیے کسی طرح زیبا نہ تھیں۔ شعر گوئی کی وجہ سے الگ کرنے کا کوئی سبب نہ تھا کیوں کہ شاعری وہاں کے شرفا کے نزدیک کوئی معیوب چیز نہ تھی۔ چناں چہ سلمہ، معدی کرب، مہلہل، حجر سب کے سب شاعر تھے۔

ایک روایت ہو کہ اس کے باپ نے اسے صرف اس بنا پر الگ کردیا کہ امرا القیس نے کسی عورت یا پڑوسن کے بارے میں تشبیب کی تھی یا شرجیل کی بیٹی عنیزہ کے متعلق اظہارِ خیال کیا تھا یہ بھی کہا گیا ہو کہ اس نے ان دونوں کے بارے میں اس وقت تشبیب کہی جب اس کے باپ نے اس کو نکال دیا اور وہ ان دونوں کے قبیلے میں جاکر مل گیا۔ تاریخ کے صفحات میں یہ بھی مرقوم ہو کہ اس کے باپ نے اس کو قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا اور اپنے ایک غلام سے کہا کہ اس کو کہیں لے جاکر اس کی دونوں آنکھیں نکال ڈالو۔ چناں چہ غلام اسے لے بھی گیا مگر معاً اسے خیال آیا کہ جب اس کے باپ کا غصہ ٹھنڈا ہوگا تو یقیناً اسے اس واقعے

سے قلق ہوگا۔ وہ گیا اور کسی جانور کی آنکھیں نکال کر اس کے سامنے لایا، اور امرؤالقیس کو کہیں چھپا دیا۔ جب باپ نے وہ آنکھیں دیکھیں تو غمگین ہوا۔ اس کے بعد غلام امراءالقیس کو لایا تو باپ بہت خوش ہوا اور اسے شعرگوئی سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ کچھ دنوں تک وہ ضبط کیے رہا۔ مگر پھر جذبات اُمڈے اور ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے۔

الا عم صباحا ایها الطلل البالی

تو اس کا باپ پھر خفا ہوا اور اسے دوبارہ گھر سے نکال دیا۔

لیکن یہ تمام روایتیں فرضی ہیں اور ان کی حیثیت افسانے سے زیادہ نہیں۔ البتہ مذکورہ بالا بیانوں میں سے اگر کوئی بات قابلِ قبول ہے تو صرف اتنا ہی کہ امراءالقیس اپنے باپ کے نکالنے سے پہلے لہو و لعب میں اتنا منہمک نہ تھا۔ چناں چہ اس کا وہ کلام پڑھیے جس کو اس نے اپنے باپ سے جُدا ہونے کے قبل کہا تھا۔

فلو انما اسعیٰ لادنیٰ معیشۃ ۔۔۔ کفانی ولم اطلب قلیل من المال

اگر تھوڑی معیشت کے لیے کوشش کروں تو میرے لیے وہ کافی ہوگی لیکن تھوڑے مال کے لیے میں جستجو نہیں کرتا

ولکنما اسعیٰ لمجد موثل ۔۔۔ وقد یدرک المجد الموثل امثالی

لیکن میں تو ایک پاے دار شرف کے لیے کوشش کرتا ہوں اور میرے جیسے انسان شرف حاصل کرلیتے ہیں۔

وما المرء مادامت حشاشۃ نفسہ ۔۔۔ بمدرک اطراف الخطوب ولا آلی

انسان جب تک زندہ رہتا ہے اپنے مقصد کے حصول کے لیے کسی کوشش سے باز نہیں رہتا اور نہ ناامید ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کا باپ اس کے بڑے بھائیوں کو اس پر ترجیح دیتا تھا اس لیے اِمراءالقیس نے اِن سے علاحدگی اختیار کرلی۔ اور اپنے دِل کو لہو و لعب سے تسلی دینے لگا۔ جب اس کو اپنے باپ کے قتل کی خبر پہنچی تو کہا "جب میں چھوٹا تھا تو مجھے ضائع کردیا اور جب بڑا ہوا تو اپنے خون کا بار مجھ پر ڈال دیا" اس سے معلوم ہوا کہ اِمراءالقیس کے خراب ہونے کا سبب خود اس کا باپ ہے وہ نہیں۔

وہ شہروں اور وادیوں کی خاک چھانتا موضع دمون میں پہنچا تھا، وہیں پر اپنے باپ کے قتل ہونے کی خبر سُنی۔ جس وقت اسے یہ خبر ملی وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل رہا تھا، اس کے دوستوں نے کھیل بند کردیا

پھر امراءالقیس نے قسم کھائی کہ وہ جب تک اپنے باپ کا قصاص نہ لے گا، تیل اور خوش بُو استعمال نہ کرے گا اور نہ کسی کھیل سے دل چسپی لے گا نہ کسی عورت سے تعلق رکھے گا اور نہ کبھی غسل کرے گا نہ شراب پیے گا اور نہ کبھی گوشت کھائے گا۔ اس نے وہ رات بڑی بے چینی سے گزاری۔ کبھی دُشمنوں کے بارے میں ہجو اور غصّے کا اظہار کرتا اور کبھی اپنی مصیبتوں کی داستان کہتا۔ کبھی رات کی درازی کی شکایت کرتا تو کبھی ماضی کی یاد میں آنسو بہاتا۔

باپ کا بدلہ لینے کے لیے اور مُلک کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے وہ ایک فوج تیّار کرنے لگا۔ جب بنی اسد کو اس کی خبر پہنچی تو انھوں نے چند آدمیوں کو وفد کی شکل میں اس کے پاس بھیجا جس میں خاص کر عبید ابنِ ابرص اور قبیصہ ابنِ نعیم بھی تھے۔ جس وقت یہ لوگ اس کے پاس پہنچے وہ چھپ گیا اور تین روز تک برآمد نہ ہوا پھر سیاہ قبا اور عمامہ پہن کر ان کے سامنے آیا۔ (عرب سیاہ عمامہ کسی بڑی مصیبت کے وقت پہنا کرتے تھے) قبیصہ اسے دیکھتے ہی فوراً آگے بڑھا اور کہنے لگا:۔

"یقیناً تم بلند مرتبہ اور ذی مرتبت آدمی ہو۔ زمانے کے انقلابات اور حوادثِ روزگار سے خوب واقف ہو اس کے لیے تمھیں کسی واعظ کی ضرورت نہیں۔ تمھارے اندر خاندانی شرافت اور منصبِ سیادت ہے۔ شریف النسل انسان لغزشوں کو معاف کردیا کرتا ہے جو کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں وہ دراصل ایک بہت بڑے سانحے کی پیش خیمہ تھیں ناممکن ہے اس کی مصیبتوں سے نزار و یمن اور کندہ کا کوئی فرد محفوظ رہے۔ تمھارا باپ ایک باوقار شخص تھا۔ اگر مقتولوں کا فدیہ لیا جائے تو ہمارے سردار فدیہ دینے میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں کرسکتے۔ لیکن وہ ایک ایسی ہستی تھی جس کا بدلہ یہ ادنا چیزیں نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے حالات کے پیشِ نظر تین شرائط میں سے ایک کو اختیار کرلو۔ اور وہ شرائط یہ ہیں:۔

(۱) بنی اسد کے سب سے شریف اور بڑے آدمی کو چُن لو جس کو ہم تمھیں سونپ دیں گے۔ وہ پوری قوم کا کفّارہ ہوگا۔

(۲) یا فدیہ لینا قبول کرو اور جتنے چاہو اونٹ لے لو۔

(۳) ورنہ اس جنگ کے لیے تیّار ہو جاؤ جس کی ہیبت سے حاملات کے حمل ساقط اور جس کے بوجھ سے پُشت خم ہوجائیں۔ اور اپنی تمام چیزوں کو جنگ کے جھنڈوں پر قربان کردیں۔"

اس بات کو سُن کر امراءالقیس آب دیدہ ہوگیا اور کہا کہ عرب اس سے اچھی طرح واقف ہیں کہ خوں بہا میں مجھ

کا کوئی ہم سر نہیں اور میں فدیے میں اونٹ وغیرہ لے کر ہمیشہ کے لیے لوگوں کے طعنے کا داغ اپنے اوپر نہیں لگا سکتا۔ لہٰذا تیسری شرط کے سوا اور کچھ نہیں۔

چناں چہ اس نے اِدھر اُدھر جاکر قبیلوں سے بنی اسد کے خلاف مدد مانگنی شروع کی۔ اس کے ماموں بکر وتغلب نے ایک لشکرِ گراں سے اس کی مدد کی۔ اس نے جاکر بنی اسد پر حملہ کردیا، بنواسد بھاگ کھڑے ہوئے۔ تو ان کا پیچھا کیا۔ جب اس کی فوج پیاس کی شدّت سے پریشان ہورہی تھی اور بنواسد ایک چشمے پر خیمہ زن تھے کہ یہ ناگاہ ان پر فوج لے کر ٹوٹ پڑا خوب لڑائی ہوئی دونوں طرف کے سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ جب رات ہوئی تو پھر بنواسد بھاگ نکلے۔ امراء القیس نے ان کا پیچھا کرنا چاہا مگر بکر وتغلب کے لوگوں نے لڑنے سے انکار کردیا اور کہا کہ اب تمھارے باپ کا بدلہ ادا ہوگیا ان کے پیچھے پڑنے کی کیا ضرورت؟ یہ کہہ کر وہ لوگ واپس لوٹ گئے۔ امراء القیس وہاں سے مرثد بن ذی جدن کے پاس گیا۔ مرثد نے اپنے پانسو آدمی اس کی طرف سے لڑنے کے لیے دیے اور کچھ عرب بھی اس کے ساتھ ہوگئے۔ ان کو لے کر بنواسد پر پھر اس نے چڑھائی کردی اور کام یاب ہوگیا۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان سخت عداوت پڑگئی اور جنگ کا سلسلہ بہت دنوں کا جاری رہا۔

ادھر منذر بن ماء السما نے جو شاہانِ کندہ کا ازلی دُشمن تھا امراء القیس کو اس حالت میں دیکھ کر اسے ہزیمت دینے کی ٹھان لی اور کسریٰ انوشرواں سے ایک جرّار فوج لے کر اس کی تلاش میں نکلا۔ حمیریوں نے جب یہ حالت دیکھی تو امراء القیس کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ عرب حلیفِ فارس اور آلِ منذر کے مقابلے میں اس کی مدد نہیں کریں گے تو وہ ان کے سیاسی حریف روم اور آلِ غسّان کی طرف متوجّہ ہوا۔ چناں چہ اس سلسلے میں وہ پہلے سموٴل بن عادیا کے پاس گیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ حارث بن ابی شمر غسانی کے نام ایک خط لکھ دے کہ وہ اس کی قیصرِ روم سے ملاقات کرادے۔ اس نے منظور کرلیا اور امراء القیس وہیں اپنا تمام سامان رکھ کر اور اس خط کو لے کر روانہ ہوا حارث کے پاس پہنچا تو اس کی بڑی عزت ہوئی اور اس نے امراء القیس قیصرِ روم "پوستینانس" کے پاس عمرو بن قمیئہ اور جابر ضبی التغلبی کے ساتھ روانہ کردیا امراء القیس جب قیصر کے پاس پہنچا تو قیصر نے بہت آؤ بھگت کی اور اپنے یہاں مہمان ٹھیرایا۔ اس کے بعد قیصر نے

امراءالقیس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور کیا کیا سلوک کیے، اس بارے میں مورخینِ عرب مشکوک نظر آتے ہیں انھوں نے بیان کیا ہے کہ قیصر نے ایک بھاری فوج سے اس کی مدد کی جس میں امرائے روم کے بہت سے نوجوان بھی تھے۔ اِدھر امرؤالقیس کے آنے کے بعد ہی بنی اسد نے اپنے ایک آدمی طَمّاح نامی کو قیصر کے پاس روانہ کردیا۔ تاکہ وہ قیصر اور اس کے درمیان اختلاف و رنجش کی خلیج حائل کردے چناں چہ جس وقت امراءالقیس فوج لے کر چلا تو اس نے امراءالقیس کے خلاف قیصر کے حضور میں زہر اُگلنا شروع کردیا۔ یہاں تک کہ اس نے یہ بھی کہا کہ امراءالقیس ایک آوارہ اور گم راہ شخص ہے حتّیٰ کہ یہاں سے فوج لےکر روانہ ہوا تو آپ کی صاحب زادی سے پیام سلام شروع کردیے اور اس کے متعلق کچھ عاشقانہ اشعار بھی کہے ہیں جو سارے عرب میں مشہور ہو چکے ہیں اس سے آپ کی اور آپ کی صاحب زادی دونوں کی بڑی رُسوائی ہوگی۔ قیصر نے جب یہ باتیں سُنیں تو وہ جی ہی جی میں پریشان ہوا اور اس غصّے میں اس نے ایک ذرہ تیّار کروائی جو زہر میں بجھی ہوئی تھی پھر اُسے امرؤالقیس کے پاس بھیج دیا۔ جس کو امراءالقیس نے عین گرمی کے دنوں میں پہن لیا پھر کیا تھا تمام زہر اس کے جسم میں سرایت کر گیا اور جسم کٹ کٹ کر گرنے لگا۔ یہ دیکھ کر جابر بن ضبی نے ایک سواری تیار کی اور اس پر سوار کرکے "انقرہ" میں پہنچایا جہاں اس کا کام تمام ہوگیا۔ پھر وہ وہیں پر دفن کردیا گیا۔

رومی مورخین مثلاً "نونوز" اور "برکوب" کا بیان ہے کہ امراءالقیس نے (وہ لوگ اس کو صرف قیس کہتے ہیں) قیصر کے پاس جانے سے پیش تر خط و کتابت کی تھی جس میں منذر و فارس کے مقابلے میں اپنے لیے مدد مانگی تھی پھر اس کے پاس گیا تو وہ عزت سے پیش آیا اور مدد دینے کا وعدہ کیا پھر اس کو فلسطین کا انتظام سپرد کردیا وہاں سے وہ جارہا تھا کہ انقرہ پہنچتے پہنچتے اس کو "ذات القروح" کی بیماری ہوگئی اور اسی مرض میں مرگیا اور انقرہ میں دفن ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ رومی مورخین کی رائیں اس بارے میں زیادہ قابلِ قبول ہیں کیوں کہ یہ واقعہ روم کا ہے اور وہاں کا مورخ غیروں سے زیادہ واقفیت رکھتا ہے پھر عرب ذات القروح کی بیماری سے بالکل آشنا نہ تھے جب امراءالقیس اس بیماری میں مبتلا ہوا تو ان کے لیے یہ ضرور اچنبھے کی بات تھی۔ یہی وجہ ہے

کہ انھوں نے اس کی موت کا عجیب وغریب قصہ گھڑ دیا ہو چناں چہ یہ لوگوں کی خاصیت بھی ہو کہ جب کوئی انوکھی چیز سمجھ میں نہیں آتی ہو تو اس کے لیے ایک علت تلاش کر لیتے ہیں۔ حالاں کہ بیان کیا جاتا ہو کہ جب قیصر کو اس کی موت کی خبر پہنچی تو اس نے حکم دیا کہ اس کا ایک پتلا بناکر قبر پر نصب کر دیا جائے چناں چہ یہ تمثال مامون الرشید کے زمانے تک موجود تھی۔ اور جب وہ رومیوں سے لڑنے گئے تو اس تمثال کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

یہ واقعہ بھی رومی مورخین کی تائید کرتا ہو کہ قیصر اور امراؤالقیس کے تعلقات موت تک خوش گوار رہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہو کہ کیا فلسطین کی سیادت یا فلسطین کے بعض قبائل پر حکومت مل جانے سے اس نے اپنی آبائی حکومت کا خیال چھوڑ دیا اور اپنے باپ کا خوں بہا لینا بھول گیا۔ جس کے لیے وہ اتنے جتن سے قیصر کی خدمت میں گیا تھا؟ اس سوال سے ضرور ہمیں تھوڑا سا شک پیدا ہوتا ہو مگر ہم کہ سکتے ہیں کہ وہ اس اقتدار سے خوش نہ تھا اور اگرچہ اس نے عدمِ رضا کا قیصر سے اظہار نہیں کیا مگر اپنی ناکامیابی سے بہت مغموم تھا اور اسی رنج سے راستے میں اس کی روح پرواز کر گئی۔

زمانۂ حال کے بعض مصری ادیبوں کا خیال ہو کہ اگر امراؤالقیس قسطنطنیہ قیصر کے پاس گیا تھا تو اس کے اشعار میں ضرور کچھ نہ کچھ اس بہترین شہر کا ذکر ہوتا، یا اس کے کلام میں کم سے کم سفر کے متعلق کچھ واقعات ہی درج ہوتے۔ جس سے اس واقعے کی تائید ہوتی۔ لیکن ان کے لیے صرف اتنا ہی بس ہو کہ روم کے مورخین نے اس سفر کا ذکر کیا ہو۔ اور اس کی تائید موجودہ دور کے مغربی مورخین کے یہاں بھی ملتی ہو۔ چناں چہ نکلسن اپنی کتاب "تاریخ ادبِ عربی" میں لکھتے ہیں:۔

"امراؤالقیس کا باپ حجر بنی اسد پر حکومت کرتا تھا جب وہ قسطنطنیہ گیا تو شہنشاہ یوسٹنیانوس نے اس کی بڑی عزت کی۔ اس لیے کہ وہ چاہتا تھا کہ کندہ کی حکومت کی تائید کر کے فارس کے پہلو میں کانٹا چبھا دے۔ اسی لیے اس کو فلسطین کا امیر بنایا۔ وہاں سے وہ جا رہا تھا کہ ناگاہ راستے میں موت آ گئی۔ اور اس طرح اس کے بارے میں کچھ اظہارِ خیال نہ کر سکا اور پھر وہ اتنا کم ظرف بھی نہ تھا کہ فلسطین کی حکومت پر خوش ہوتا اور اس کے لیے شعر کہتا پھر بھی اس سفر کی یادگار اس کے ان اشعار سے واضح ہو جاتی ہو۔ ؎

تذکرت هنداً و اترابها　　　فاصبحت ازمعت منها صدودا
و نادمت قیصر فی ملکه　　　فاوجهنی و رکبت البریدا

ان تمام واقعات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ باپ کی وفات کے بعد امراءالقیس کی حالت پہلے جیسی نہ رہی اور وہ خوں بہا کی خاطر خوں ریزی پر تُل گیا اور اس بات کو نظر انداز کردیا کہ اس کے باپ کا قتل ظلم و جبر کے سبب ہوا اس نے کشت و خون کے ذریعے ملک واپس لینے کی خواہش کی۔ حالاں کہ اس کو چاہیے تھا کہ جب بنی اسد کا وفد اس کے پاس آیا تھا تو اسی وقت ان کی شرائط کے مطابق صلح کرلیتا۔ لیکن وہ شبابی جذبات پر قابو پاکر بدلہ لینے کے لیے آمادہ ہوگیا جس کا انجام تباہی ہوا۔ بہرحال امراءالقیس کے اس زمانے کے اشعار بہترین ہیں کیوں کہ جب اس کے اعوان و انصار اور یاروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو یک بیک اس کی آنکھوں کے پردے اٹھ گئے اور وہ اس غم میں اپنے تجربات اور حکمت کی باتیں بیان کرنے لگا۔

سالِ وفات عام مورخین کا خیال ہے کہ امراءالقیس چھٹی صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ بعض اس کو پانچویں صدی سے پہلے بتاتے ہیں لیکن اگر اس کا باپ ۵۲۹ء میں قتل ہوا ہے تو زیادہ ارجح روایت یہ ہوگی کہ وہ ۵۰۰ء میں پیدا ہوا چناں چہ ریتان فرانسیسی کا بھی یہی بیان ہے بعض روایت میں یہ بھی ہے کہ وہ ۵۲۵ء میں پیدا ہوا اور ۵۶۵ء میں وفات پائی۔ ایک روایت میں ہے ۵۴۵ء میں مرا ہے لیکن ہمارے لیے کوئی خاص سن متعین کرنا ناممکن ہے کیوں کہ اس زمانے کی طرح اس وقت سن کا التزام نہیں کیا جاتا تھا

قومیت اور مذہب انسان کی زندگی پر دین و مذہب کا ایک گہرا اثر پڑتا ہے اس کے اخلاق و معاشرت خیال و عمل پر مذہب کا رنگ جھلکتا ہے۔ اب تک جہاں ہم نے امراءالقیس کی زندگی کے واقعات پر تبصرہ کیا مناسب ہے کہ اس کے عقائد اور مذہب کے متعلق بھی عرض کردیں تاکہ آپ کلام پر نظر ڈالتے وقت یہ امور پیشِ نظر رہیں۔

سب سے پہلے اس کے جدِ اکبر حارث نے جب منذر بن ماءالسماء نے مزدکیت کے اختیار کرنے سے انکار کردیا تو اس نئے مذہب کو اختیار کرکے حکومت کا وارث بن گیا اور قباذ نے اس کے صلے میں حیرہ کی حکومت عطا کی پھر "الناس علیٰ دینِ ملوکهم" کے مصداق کندیوں کا بھی اسی مذہب پر عمل ہوگیا۔ اس سے یہ بھی

معلوم ہوتا ہو کہ کندیوں کا مذہب کے بارے میں کوئی مستقل اور پائے دار نظریہ نہ تھا۔ چناں چہ جب قباذ مرگیا اور اس کی جگہ پر انوشیرواں بادشاہ ہوا اور حارث کو اس نے حیرہ سے معزول کردیا تو پھر انھوں نے اپنا مذہب تبدیل کرلیا۔

ان حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہو کہ اس کا قبیلہ مصالح اور اغراض کے ماتحت مذہب کا پرستار تھا ان کے نزدیک عرب میں نہ تو کوئی بُت قابلِ احترام تھا نہ مزدکیت قابلِ ستایش اور نہ مجوسیت کوئی اہمیت رکھتی تھی اور نہ وہ نصرانیت ہی سے کچھ مانوس تھے۔ اسی ماحول سے امراء القیس کا بھی متاثر ہونا ضروری ہو اس لیے ہم کہ سکتے ہیں کہ اس نے لامذہبیت میں پرورش پائی۔ زمانۂ شباب میں اس نے شہوات و لذات کی پرستش کی اور اپنے نزدیک دُنیا کی تمام چیزوں کو مباح کرلیا۔ اسی لیے بعض علما کو شبہہ ہوا ہو کہ وہ مزدکیت کا پیرو تھا۔ اور اس کی آڑ میں اپنے خاندان والوں کی طرح اپنا مقصد پورا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہو کیوں کہ مزدکیت میں مال و آبرو وغیرہ تو ضرور مباح ہو لیکن قتل و خوں ریزی ان کے نزدیک کسی طرح جائز نہیں ہو۔ امراء القیس کا عمل اس کے برعکس ہو۔ کیوں کہ جب بنو اسد اس کے باپ کے بدلے میں ایک شخص کو دے رہے تھے تو وہ اس پر راضی نہ ہوا۔ پھر جب وہ بنی اسد سے لڑنے کے لیے نکلا تو ایک بُت ذوالخلصہ نامی کی طرف سے اس کا گزر ہوا جہاں پر عرب لوگ تیروں کے ذریعے فال نکالا کرتے تھے۔ امراء القیس نے بھی فال نکالی تو موافق نہ نکلی، دوبارہ سہ بارہ تیر ڈالے لیکن ہر دفعہ جواب نفی میں نکلا جس سے اسے طیش آگیا تیروں کو بُت کے منھ پر پھینک دیا اور اسے بہت سخت و سست بھی کہا۔ اور گالی دے کر وہاں سے چلا گیا۔ اس سے بھی یہی پتا چلتا ہو کہ امراء القیس کا کوئی خاص عقیدہ نہ تھا وہ صرف مصلحت پرست تھا۔ جیسا موقع ہوتا اپنے مقصد کے مدِنظر اس مذہب کا تھوڑی دیر کے لیے حامی بن جاتا۔ اور جب اس کا مقصد پورا ہوجاتا تو فوراً اس سے کنارہ کشی اختیار کرلیتا اس معاملے میں اس کے نزدیک عرب کی بُت پرستی اور دوسرے تمام مذاہب یکساں تھے۔

اس کا نام امراء القیس (قیس) بُت کے نام پر اس لیے نہیں پڑا کہ وہ اس کا معتقد تھا۔ بلکہ ایک محبوب الّسان ہونے کی وجہ سے اِس نام سے موسوم ہوگیا۔ آج بھی کتنے ملحدین ہیں جن کا نام علی حسین وغیرہ ہوگا۔

صرف نام کی وجہ سے امرا لقیس کے عقیدے پر فتوا نہیں لگایا جاسکتا۔

بعضوں نے امرا لقیس کو نصرانی شعرا میں شمار کیا ہو ان کا خیال ہو کہ اس کے آبا نے اس مذہب کو حیرہ میں قبول کیا تھا۔لیکن اصل یہ ہو کہ حیرہ پر ان کا قبضہ تو مزدکیت کے سبب حاصل ہوا وہ جب تک حیرہ میں رہے کسی دوسرے مذہب سے بالکل ناآشنا تھے۔ البتہ امرا لقیس کی ایک چچی ہندہ بنت حارث اور بعض دوسری رشتے دار عورتیں نصرانی تھیں۔اس سے اس کا نصرانی ہونا لازم نہیں آتا۔ اس لیے کہ اس خاندان کے لوگ اس عورت کے گھر سے بہت دور دیہات میں رہتے تھے اور وہ "حیرہ" میں جاکر اس وقت نصرانی ہوئی جب کہ اس کی شادی منذر بن ماءالسما سے ہوئی ۔ لیکن امرا لقیس کا نصرانی ہونا بعید بھی نہیں ہو کیوں کہ جس وقت عربوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ قیصر کے پاس مدد کے لیے گیا تو شاید اس نے سوچا ہو کہ جس طرح اس کے آبا و اجداد مذہب کی آڑ میں شکار کھیلتے رہے اسی طرح وہ بھی مصلحتاً عیسائی ہو جائے اور شاید یہی وجہ ہو کہ اس کی موت کے بعد قیصر نے اس کی بڑی عزت کی۔اور ایک تمثال اس کی قبر پر نصب کرادی۔

امرا لقیس کے اشعار میں بعض جگہ "اللہ" کا بھی نام آیا ہو مگر وہ اس طرح پر کہ اس کے عقیدے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۔چناں چہ وہ کہتا ہو ؎

فقالت سباك الله انك فاضحی　　الست تری السمار والناس احوالی

فقلت یمین الله ابرح قاعداً　　ولو قطعوا رأسی لدیك واوصالی

حلفت لها بالله حلفة فاجر　　لناموا فما ان من حدیث ولا صالی

والله انجح ما طلبت به　　والبر خیر حقیبة الرحل

آخری شعر سے واقعی مذہبیت کا پتا چلتا ہو اور معلوم ہوتا ہو کہ یہ کسی خداترس آدمی کا شعر ہو چناں چہ بعض لوگوں کا خیال بھی ہو کہ اس کا یہ شعر کبھی نہیں ہوسکتا بلکہ کسی دوسرے کا ہو اور غلط طور پر اس کی جانب منسوب ہوگیا ہو۔ اس قسم کی باتیں امرا لقیس جیسے آوارہ منش اور رندانِ قدح خوار کی زبان سے ادا نہیں ہوسکتیں۔ اس بارے میں محققین کی یہ رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہو کہ اس قسم کے جتنے اشعار اس کے دیوان میں ملیں گے سب کے سب ہنسی دل لگی کے طور پر لکھے گئے ہیں۔

...لی زبان

جس عربی زبان میں امراء القیس کا کلام موجود ہے وہ عدنانی زبان ہے کیوں کہ اس کا قبیلہ کندہ بھی عدنانی ہے اس لیے اس کا کلام اگر عدنانی زبان کے مطابق ہو تو کوئی تعجب نہیں ۔ لیکن جمہور علمائے انساب کا خیال ہے کہ وہ قحطانی ہے تو اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ قبیلہ کندہ نجد کی طرف چلا گیا ہوگا اور عدنانیوں ...ان پر اس نے حکومت کی ہوگی ۔ غالباً یہ زمانہ حسّان بن تبع کا زمانہ ہے جو پانچویں صدی کے اوائل میں تھا (۴۲۰-۴۲۵ء) اور یہ خاندان پورے پانچویں صدی میں یا چھٹی صدی کے اوائل تک یعنی امراء القیس کے ظہور تک رہا اس زمانے میں یمن پر حبشہ کا قبضہ ہوگیا اور حمیر کی حکومت وہاں سے ختم ہوگئی، اس کے ساتھ ساتھ کندہ کے تعلقات ...س سے منقطع ہوگئے تو وہ شمال کی طرف چلے گئے اور ان کے تعلقات عدنانیوں سے استوار ہوتے گئے ۔ پھر ...ن کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں مختلف قبیلوں پر قائم ہوتی رہیں ۔ انھی چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں ایک حجر کی بھی حکومت تھی جو بنی اسد پر حکمران تھے ۔ اس طرح علمائے انساب کے نزدیک امراء القیس کے کندی قحطانی خاندان کی زبان عدنانی ہوگئی ۔

ان تمام دلائل کے علاوہ ایک اور دلیل بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امراء القیس کا عدنانی زبان ...سے متاثر ہونا ناگزیر تھا ۔ امراء القیس کی ماں فاطمہ تغلبی تھی جو عدنانی ہے ظاہر ہے ماں کا اثر اولاد پر بہت زیادہ ...ہوتا ہے خصوصاً زبان اور عادات و اخلاق پر تو بہت گہرے نقوش مرتسم ہوتے ہیں ۔ پھر امراء القیس جن دو شاعروں کی صحبت سے فیض یاب ہوا وہ عدنانی ہیں ۔ اور اس کے باپ کا شاعر "عبید ابنِ ابرص" بھی عدنانی ہے جن نے امراء القیس کے کلام پر انھی دونوں شاعروں کی طرح اثر ڈالا ہے مختصر یہ کہ یہی وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر یہ قحطانی شاعر عدنانیوں کی صف میں نظر آرہا ہے ۔

بعض مستشرقین نے ان تمام حوائل سے قطع نظر کرکے کہہ دیا ہے کہ یہ تمام اشعار جو عدنانی زبان میں ہیں اور امراء القیس کی طرف منسوب ہیں غلط ہیں اس لیے کہ وہ قحطانی تھا ہم اس بارے میں انھیں معذور سمجھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ انھیں واقعات کا صحیح علم نہیں اور ان کی نظریں حقیقت رس نہیں ہیں پھر ان ...دیوں کی عقل پر حیرت ہے جو کہتے ہیں کہ یہ اشعار اس کی طرف غلط منسوب ہیں اگر یہی ان کے نزدیک معیارِ تحقیق و ...نظر ہے تو پھر اس طرح سے ایک ہزار برس کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ "احمد شوقی بک" کے تمام اشعار منسوب الیہ

ہیں۔کیوں کہ وہ عربی نہیں ہیں اور ان کے اشعار کی زبان عربی ہو۔

عدنانی زبان کے مختلف لہجے تھے اور امراء القیس کا کلام بھی اس کے قبیلے کے لہجے سے مختلف ہو تو پھر سوال پیدا ہوتا ہو کہ عربی میں شعر اختلافِ لہجات سے پہلے آیا یا اس کے بعد؟ اس مشکل سوال کے جواب میں یہی کہا جاسکتا ہو کہ عربی زبان کا اختلافِ لہجات سے پہلے ایک مدت دراز تک بغیر شعر و ادب کے رہنا غیر معقول سی بات ہو۔ سچ پوچھیے تو اختلاف لہجات سے پہلے ادب اور شعر موجود تھے اور جو لوگ اس زمانے کے قریب گزرے ہیں وہ سب کے سب اسی طرز پر شعر کہا کرتے تھے۔ وہ جدت بھی اگر پیدا کرتے تھے تو وہ فقط لفظی ہوتی تھی۔ اس زمانے میں ادب کی ایک متفقہ زبان تھی مگر معدودے چند افراد ایسے بھی تھے جو اس شاہ راہ سے ہٹ کر گفتگو کرتے تھے۔ پھر جب خفیف سا لہجہ تبدیل ہوا تو اس وقت بھی اس کی کوئی اہمیت نہ تھی اور وہ سب کے سب ایک دوسرے کی زبان اور لہجے سے بخوبی آشنا تھے۔ آج بھی ہم کو بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جو عربی میں قدامت کا نشان ہیں اور ان سے ان شعرا کا بھی پتا چلتا ہو جو اسلام سے پہلے گزرے۔ تاریخ میں بھی ان کے نام زندہ ہیں اگر ان کے اشعار دست یاب نہ ہوتے تو وہ کبھی کے فراموش کردیے گئے ہوتے۔ ان غیر معروف شعرا میں ایک "ابنِ خزام" ہو جس کا ذکر امراء القیس نے اپنے شعر میں کیا ہو ؎

عوجا علی الطلل المحیل لاننا　　　نبکی الدیار کما بکی ابن خزام

علامہ سیوطیؒ اپنی کتاب "المزہر" میں لکھتے ہیں:-

"ابنِ خزام کے متعلق صرف اتنا معلوم ہو کہ وہ قبیلۂ طی کا فرد ہو اس کے علاوہ اس کے اشعار کا پتا نہیں اور نہ اس کے علاوہ کہیں اس کا ذکر ملتا ہو۔"

زہیر بن سلمی کہتا ہو ؎

ما ارانا نقول الا معارا　　　او معاداً عن لفظنا مکرورا

اس شعر میں زہیر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہو کہ اس کے معاصرین کے کلام شعرائے قدیم کے کلام سے مستعار ہیں عنترہ بن شداد العبسی کہتا ہو ؎

هل غادر الشعراء من متردّم　　ام هل عرفت الدار بعد توهّم

اس شعر میں وہ کہتا ہے کہ اگرچہ قدما نے کچھ نہیں چھوڑا ہے مگر پھر بھی وہ نیا شعر پیدا کر سکتا ہے۔

کلام کی تدوین

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عرب چوں کہ اُمّی و ناخواندہ تھے اس لیے اسلام سے پہلے وہ قدیم شعرا کے کلام مدوّن نہ کر سکے لیکن یہ خیال صحیح نہیں بلکہ ان کی نظر سے شعرائے جاہلیت کے کلام نہیں گزرے ہیں ورنہ معلوم ہوتا کہ کلامِ عرب کے نہ مدوّن ہونے کے خاص اسباب ہیں۔ اور شاید انھی اسباب کے ماتحت اسلام کے دوسو برس بعد ان کا کلام صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوسکا۔

یوں تو ان کی کتابت کا حال آلِ منذر کے وقت سے معلوم ہوچکا ہے لیکن پھر بھی اس بارے میں ان کے کلام سے پتا چلتا ہے کہ وہ لکھنے پڑھنے کے فن سے بالکل ناآشنا نہ تھے البتّہ وہ تحریر و کتابت کو بہت معیوب سمجھتے تھے اور وہ فطرۃً ہر چیز کو زبانی یاد رکھنے کی کوشش کرتے تھے چناں چہ حدیثوں سے بھی اس کی تائید ملتی ہے:-

"مذهب العرب انّهم كانوا مطبوعين على الحفظ مخصوصين بذالك"

اصل یہ ہے کہ عرب کا بدو کتابوں کے طومار کو دیکھ کر مذاق اُڑاتا تھا ان کا یہ عام چلتا ہوا فقرہ تھا "حرف فی تامورك خير من عشرة فی كتبك" دِل میں ایک حرف کا محفوظ رکھنا کتابوں کی دس باتوں سے بہتر ہے" عرب کا مشہور شاعر کہتا ہے ؎

ليس بعلم ما حوى القمطر　　ما العلم الّا ما حوى الصدر

علم وہ نہیں ہے جو کتابوں میں درج ہے۔　　نہیں ہے علم لیکن صرف وہی جو سینے میں محفوظ ہو۔

دُوسرا کہتا ہے ؎

استودع العلم قرطاساً فضيعه　　وبئس مستودع العلم القراطيس

جس نے علم کو کاغذ کے سپرد کیا اس نے اسے ضائع کیا علم کے بدترین مدفن کاغذ ہیں۔

تیسرے کا شعر ہے ؎

علمی معی حیث ما یممت احملہٗ ۔۔۔ بطنی وعاء لہ لا بطن صندوق

میرا علم میرے ساتھ ہے جہاں جاتا ہوں اسے اٹھائے لیے جاتا ہوں میرا باطن اس علم کا برتن ہے نہ کہ شکمِ صندوق۔

ان کنتُ فی البیت کان العلم فیہ معی ۔۔۔ اذا کنتُ فی السوق کان العلم فی السوق

اگر گھر میں رہتا ہوں تو علم میرے ساتھ رہتا ہے جب بازار میں ہوتا ہوں تو میرا علم بھی بازار میں ہوتا ہے۔

ان اشعار سے عربوں کے خاص رجحان کا پتا چلتا ہے اور لکھنے اور کتابت کے متعلق ان کا نقطۂ نظر اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے۔ اس خاص مذاق کا نتیجہ تھا کہ قدرتی طور پر ان کو اپنے حافظے پر بھروسا کرنا پڑتا تھا ظاہر ہے کہ انسان اپنی جس قوت کو زیادہ استعمال کرتا ہے اس میں جِلا پیدا ہوجاتی ہے۔ مختلف اقوام کی مختلف چیزوں کے ساتھ خاص مناسبت کی غالباً یہی وجہ ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ "ان العرب قد خصت بالحفظ" عرب قوتِ حافظہ میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ ان کے قوتِ حافظہ کے حیرت انگیز واقعات کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔ لیکن کتابی قوموں کے لیے ان کا باور کرنا دشوار ہے۔ بہرحال کلامِ عرب کی تدوین عہدِ عباسی سے شروع ہوئی اور اس عہد کے علما نے خاص طور پر اس کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ ان میں سے بعض ثقہ علما مثلاً ابوعمرو بن علا، اصمعی، خالد بن کلثوم اور محمد بن حبیب نے امراء القیس کا کلام بھی جمع کیا۔ ان کے بعد ابوسعید السکری، ابوالعباس احول، ابن سکیت وغیرہ اس کے اشعار کی روایتوں کو اکٹھا کرتے رہے ان کے علاوہ اور بہت سے ثقات جیسے ابوعبیدہ اور ابوعمرو الشیبانی اور مفضل الضبی نے نے ان اشعار کی روایتوں کی کاٹ چھانٹ کی اور بہت سے اشعار کا اضافہ کیا۔ سب سے زیادہ ثقہ روایت ابوحاتم السجستانی کی ہے، جس کو وہ اصمعی سے روایت کرتے ہیں بہتر ہوگا ان رواۃ کے متعلق آئمۂ جرح تعدیل کی رائے معلوم کرلی جائے۔

(۱) ابوعمرو بن علا ـــــ ان کا نام قرائے سبعہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ عربی ادب، قرآن اور شعر کے زبردست عالم تھے۔ اتنی کتابیں تصنیف کیں جن کا انبار ان کے کمرے کی چھت تک اونچا جاتا تھا۔ انھوں نے روایات میں بہت محنت سے کام لیا تھا اور جب قرآن کے متعلق ان پر کوئی الزام نہیں تو

شعر میں کیسے ہوسکتا ہے۔ ان کی وفات ۱۵۴ھ میں ہوئی۔

(۲) اصمعی ــــــ نام عبدالملک بن قریب ہے۔ نحو، لغت، تاریخ میں ان کا ثقہ ہونا مسلّم ہے۔ ربیع بن سلیمان نے امام شافعی سے سُنا وہ کہا کرتے تھے کہ "اصمعی جیسی عبارت سے کوئی عرب فوقیت نہیں لے گیا۔" مامون نے بہت چاہا کہ اصمعی اس کے پاس چلے آئیں مگر وہ نہ آئے۔ اکثر مشکل مسائل مامون ان کے پاس بھیجا کرتا۔ قرآن و سنّت کی تفسیر میں اصمعی بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ جب کوئی قرآن و سنّت کی باتیں پوچھتا تو وہ کہتے کہ عرب اس کے معنی یہ بیان کرتے ہیں اور میں اس سے زیادہ کتاب و سنّت کے بارے میں اور نہیں جانتا۔ ان کی وفات ۲۱۶ھ میں ہوئی۔

(۳) ابوعبیدہ ــــــ نام معمر بن مثنّیٰ ہے حافظ کہتے ہیں کہ تمام علوم میں اس سے زیادہ کوئی ماہر نہیں۔ اس کی سب سے زیادہ معلومات غریب اشعار، 'اخبارِ عرب' اور 'ایامِ عرب' میں ہے۔ ابوعبیدہ' اصمعی اور ابوزید انصاری تینوں ایک ہی زمانے میں آئمہ ادب تھے۔ مگر تینوں میں جامعیت ابوعبیدہ کے اندر تھی۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ابوزید نحو کا سب سے بڑا عالم تھا۔ علی بن مدینی بیان کرتے ہیں کہ ابوعبیدہ عرب کے متعلق جو کچھ بیان کرتے ہیں بالکل صحیح بیان کرتے ہیں ان کی وفات ۲۰۹ھ میں ہوئی۔

(۴) ابوحاتم سجستانی ــــــ نام سہل بن محمّد ہے یہ کثیرالرّوایت تھے لغت اور شعر سے خوب واقف تھے اور عروض بھی بہت اچھا جانتے تھے۔ لغت میں ان کی بہت سی تالیفات ہیں۔ ان کے بیانات بہت صحیح ہیں۔ کتابوں پر بہت عبور تھا۔ مشکل سے مشکل مسائل حل کرتے تھے۔ اور نہایت دقیق النظر تھے ان کی وفات ۲۵۵ھ میں ہوئی۔

اکثر وہ کتابیں جن میں امراءالقیس کے اشعار جمع کیے گئے ہیں یا ان کی شرح کی گئی ہے ان کا دار و مدار انھی علما کی روایتوں پر ہے۔ ان میں سے خاص کر حاتم اصمعی سے جو روایت کرتے ہیں وہ حسبِ ذیل ہے۔

(۱) "شرح دیوانِ امراءالقیس" ــــــ وزیر ابی بکر عاصم بن ایوب بطلیموسی النحوی متوفی ۴۹۱ھ کی ہے۔ یہ کتاب بار بار شائع ہوچکی ہے۔ گو اس کتاب میں کہیں یہ ذکر نہیں کہ یہ روایت کس سے لی گئی ہے مگر جہاں تک

پتا چلتا ہو کہ ابوحاتم کی روایتیں ہیں البتہ صرف دو قصیدے ایسے ہیں جن کے متعلق نہیں کہا جاسکتا کہ یہ روایت کس کی ہو۔

(۲) " دواوین الشعرا الستۃ الجاہلین " ـــــ یعنی امراءالقیس ، علقمہ ، زہیر ، نابغہ ، طرفہ ، عنترہ کے کلام اس کتاب میں جمع کیے گئے ہیں ۔ اس کا ایک نسخہ مغربی مطبع کا چھپا ہوا مکتبۂ ملکیہ مصریہ میں موجود ہو۔ جس کے اندر اشعار کی شرح بھی موجود ہو۔ اس کتاب کی ابتدا امراءالقیس کے شعر سے ہوتی ہو۔ کل اٹھائیس[۲۸] قصائد بروایت حاتم جمع کیے گئے ہیں ۔ اس کے پہلے اور آخری قصیدے کے علاوہ تمام قصیدوں کی شرح وزیر ابوبکر نے کی ہو ۔ اور آخر میں لکھا ہو" حاتم کا بیان ہو کہ جن قصائد کی اصمعی نے تصحیح کردی ان سے یہ الگ ہو اور اس کے بہت سے اشعار اس کے مصاحبوں کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں "۔ ہم کچھ ایسے چیدہ اور منتخب قصائد پیش کرتے ہیں جن پر ابوحاتم کی نظر نہیں پڑی ہو اصمعی ان کو ربیعہ بن حشم کا قصیدہ بتاتے ہیں مثلاً

(۱) احار بن عمر کانی خمر　　(۲) الا انعم صباحا ایہا الربع فانطق　　(۳) امن ذکر سلمی اذ نانک تنوص

(۴) حی الحمول بجانب العزل　　(۵) تطاول لیلک بالاثمد　　(۶) جزعت ولم اجزع من البین مجزعا

اس دیوان کے ایک قصیدے (اعنی علی برق اراہ ومیض) کے متعلق کہا جاتا ہو کہ یہ ابوداؤد کا ہو چنانچہ یہ حاتم کی روایت ہو تین اور بھی قصیدے ہیں جن کو وزیر ابی بکر نے حاتم سے روایت کی ہو مختلف فیہ ہیں۔

ان قصائد کی طرف ایک اور مقطع کا اضافہ کیا جاتا ہو ؎ ـــــ " الا لا تکن ابل فمعزی "

وزیر ابوبکر نے اپنی شرح میں لکھا ہو کہ اصمعی کے نزدیک یہ امراءالقیس کا مقطع نہیں بلکہ ان کا قیاس حطئیہ کی طرف ہو ۔ قصیدۂ " خلیلی مرابی علی ام جندب " کے متعلق عام طور پر خیال ہو کہ وہ امراءالقیس کا نہیں ہو ۔

(۳) " عقد الثمین فی دواوین شعراء الستۃ الجاہلین " ـــــ نابغہ ، عنترہ ، طرفہ ، زہیر ، علقمہ اور امراءالقیس کے کلام اس کے اندر ہیں ۔ اس کا مولف ۱۲۸۲ھ میں پیدا ہوا ۔ موسیو ولیم ابن الورد بروسی نے اس کی تصحیح اور تزئین کے بعد شائع کیا ہو۔ ان قصائد میں ولیم نے کچھ بھی زیادتی نہیں کی ہو۔ صرف

ان قصائد کو حروفِ ابجد کے قاعدے پر ترتیب دے دیا ہے۔ نیز اس میں اصمعی، ابو عمرو بن علا، معضل اور ابوسعید السکری کی روایات جمع کردی ہیں اور تمام شعرا کے قصائد کی شانِ نزول کی ایک ایک فہرست بھی مرتب کردی ہے۔ البتہ روایات کے ضمن میں کچھ قصائد اور مقطعے ذکر کر دیے ہیں اور ان اشعار کے متعلق حاشیہ چڑھادیا ہے جو ان شعرا کی طرف منسوب ہیں۔ منسوب شدہ قصائد کے مطلع حسب ذیل ہیں:۔

(۱) قالت الخنساء لما جئتها (۲) اجارتنا ان الخطوب تنوب (۳) أذكرت نفسك مالن يعودا

(۴) لمن طلل بين الجدية والجبل (۵) طرقتك هند بعد طول تجنب (۶) الم يحزنك ان الدهر غول

(۷) الحرب اول ما تكون فتية

(۴) "شرح دیوان شعر الستة الجاہلین" ـــــ اس کا ایک نسخہ مکتبۂ ملکیہ مصریہ میں موجود ہے مگر اس میں مؤلف کا نام نہیں ہے صرف یہ لکھا ہے کہ تالیف کر کے سیف الدولہ ابوالولید اسماعیل بن معتضد باللہ کو ہدیتہً پیش کیا گیا۔ احمد بن عبد بن المختار کے خط میں مغربی مطبع میں چھپا ہوا ہے۔ اس کے مؤلف نے اصمعی کی روایت پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔ پھر منتخب قصائد کا ذکر کیا ہے جن کی روایت اصمعی کے علاوہ اوروں سے لی ہے لیکن اس نے اصمعی کے تمام قصائد کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اس کا مقصد چیدہ قصیدوں کا جمع کرنا تھا۔

(۵) "نزهة ذوی الكيس وتحفة الادبار فی قصائد امراالقیس اشعر الشعرا" ـــــ اس کا ایک نسخہ مکتبۂ ملکیہ مصریہ میں موجود ہے اور ۱۸۳۱ء میں دار الطبائع السلطانیہ میں چھپی ہے۔ اس کے ساتھ ایک مقدمہ اور قصیدوں کا ترجمہ بھی ہے۔ فرانسیسی زبان میں بعض ملاحظات بھی درج ہیں اس کا مؤلف زیادہ تر ابوالحجاج بن سلیمان سے روایت کرتا ہے اس نے ابو حاتم کی روایت سے معلقہ کو حذف کر دیا ہے۔

(۶) "دیوان امراالقیس" ـــــ اس کی روایتیں ابوسہل خربنداذ بن شینکی ہیں جو ابوالحسن علی بن عبداللہ بن سنان الطوسی اور ابونصر احمد بن حاتم کی جو اصمعی اور ابوعمرو الشیبانی سے روایت کرتے ہیں اور انھی لوگوں کی روایت کے مطابق اس کے قصیدے کی شرحیں بھی ہیں۔ اس کتاب کا ایک نسخہ عثمانی خط میں مکتبۂ ملکیہ مصریہ میں موجود ہے۔

کتاب کی ابتدا ابوالحسن علی طوسی کی روایت سے شروع ہوتی ہے اور ابونصر کا ذکر صرف ایک یا دو شعر میں

آیا ہو۔ اس دیوان میں وہ تمام قصائد اور مقطعے بھی ہیں جن کو ابو حاتم نے اصمعی سے روایت کی ہو اور ان منسوب الیہ قصائد اور مقطعات کا بھی ذکر ہو۔

(۷) " دیوانِ امرؤالقیس " ـــــ اس کی روایتیں ابوسہل ماخر بنداد کی ہیں جو ابوجعفر کوفی اور ابوعمر اصطخری سے روایت کرتے ہیں۔ ان کا بیان ہو کہ محقق نے ان تمام روایات کو ابوجعفر احمد بن حسن کوفی کو شیراز میں سُنایا پھر ابوعمر حفص بن عمر العبدی اصطخری کو سُنایا اور ابوجعفر کا بیان ہو کہ انھوں نے ابوہشمی اور اصمعی کے بعض اصحاب کو بھی پڑھ کر سُنایا۔ ابوعمر کا بیان ہو کہ انھوں نے ابوعبیدہ حسن عبدی اور ابومسعود سلمہ بن عبد کو سنایا اس کتاب میں بہت سے منسوب الیہ قصائد بھی درج کیے گئے ہیں۔

(۸) " دیوانِ امرارلقیس " ـــــ اس میں شیخ محمّد محمود کی شرح بھی شامل ہو اور اس میں وہ اشعار بھی جمع کیے گئے ہیں جو دیوانِ شعراستہ میں بالکل ہی نہیں ہیں۔ اس میں ایک قصیدہ ایسا بھی آیا ہو جس کو سہل نے حاتم کی روایت سے چھوڑ دیا تھا اس کا مطلع ہو ع (منعت اللیث من اکل بن حجر) مگر اس کو منسوب الیہ شمار کیا ہو۔

اب اگر ہم ان تمام قصائد کا شمار کرنا چاہیں جو مختلف روایات سے امرارلقیس کے تسلیم کیے گئے ہیں تو ان کی تعداد سَو سے زائد ہوتی ہو حالاں کہ محققین کا بیان ہو کہ امرارلقیس بہت کم گو شاعر تھا اور زیادہ سے زیادہ اس کے کل بیسؔ قصائد اور قطعات ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ قصائد جن کو سہل بن ابوسہل خربنداد نے بیان کیا ہو ان کا غیر مشہور اور مضطرب ہونا یقینی ہو۔

ابن ندیم اپنی کتاب میں علی بن عبداللہ طوسی اور احمد بن حاتم کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں یہ لوگ ان کے نزدیک ان لوگوں میں نہیں ہیں جنھوں نے کلامِ امرارلقیس کی تدوین میں کوئی حصّہ لیا ہو۔

اس سلسلے میں اگر ہم اس مجموعے کا کچھ ذکر کریں تو بے محل نہ ہوگا جس میں نام ور شعرائے جاہلیت کے سات قصائد ہیں۔ اور سب سے پہلا قصیدہ امرارلقیس کا ہو۔ ع

قفا نبك من ذكرى حبيب و منزل

مورّخین کا خیال ہے کہ یہ تعداد میں بہت زیادہ تھے البتہ تدوین کے زمانے تک گھٹتے گھٹتے ان کی تعداد صرف سات رہ گئی۔ یہ معلّقات حماد راویہ نے ۱۵۶ھ (عہدِ عباسیہ) میں جمع کیے تھے اور چوں کہ یہ بہترین انتخاب تھا لہٰذا کل قصائد مقبول ہوئے۔

عام طور سے مشہور ہے کہ یہ قصائد خانۂ کعبہ میں لٹکائے گئے تھے اس وجہ سے معلّقات کے نام سے مشہور ہوئے لیکن زمانۂ حال کے محقّقین کا خیال ہے کہ یہ وجۂ تسمیہ بالکل سطحی ہے ان کے نزدیک معلّقہ کا مادّہ اشتقاق علق ہے جس کے معنی شئ نفیس اور قیمتی کے ہیں اور چوں کہ ان قصائد کے اشعار جواہرات کے ہم پلّہ مانے جاتے تھے اس لیے معلّقہ کہلائے جس کی تائید دوسرے نام السموط (موتی کی لڑیاں) سے ہوتی ہے اور چوں کہ یہ قصائد بڑے ہیں اس لیے ان کو "سبع الطّوال" بھی کہتے ہیں۔ ابن رشیق کا خیال ہے کہ معلّقات کو "مذہبات" بھی کہتے تھے کیوں کہ یہ قصائد قباطی (مصر کا ریشمی کپڑا) پر سونے کے پانی سے لکھ کر حرم کعبہ میں لٹکائے جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ عرب اس کو الہامی کلام تصوّر کرتے تھے اور جس طرح سینکڑوں خداؤں کو سجدہ کرتے تھے اسی طرح یہ معلّقات بھی برسوں مسجودِ خلائق رہے۔ ان قصائد کا ترجمہ یورپ کی متعدّد زبانوں میں ہو چکا ہے اور امراءالقیس کے عاشقانہ کلام خاص طور پر پسند کیے گئے ہیں۔

عہدِ اسلام میں بصرہ اور کوفہ کے علما نے عہدِ جاہلیت کے کلام کو مختلف حیثیتوں سے جمع کیا بعض نے صرف ایک شاعر کا دیوان مرتّب کیا تو بعض نے کلیات ترتیب دیے جن شعرا کے دیوان مرتّب ہوئے وہ حسبِ ذیل ہیں:-

امراءالقیس، نابغہ، زہیر، عنترہ، طرفہ، علقمہ، عروہ، لبید، حاتم، ردس بن حجر، حادرہ، خنسا۔

یہ دیوان مصر، بیروت اور یورپ میں چھپ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ دیوانِ مختارات شعرائے عرب مرتبہ ابن الشجری اور ہزلئین کے مجموعے جداگانہ ہیں۔ مفضل ضبّی نے شاہ زادوں کی تعلیم کے لیے خلیفہ منصور عباسی کے حکم سے ۱۲۸ نظموں کا مجموعہ مرتّب کیا تھا جو 'مفضلیات' کے نام سے یورپ نے شائع کیا ہے۔ اسی ذیل میں حماسہ ابوتمام اور حماسہ بحتری کے کلیات بھی ہیں۔ ایام العرب میں حرب داحس اور حرب بسوس کی رزمیہ نظمیں الگ ہیں بعض ادیبوں نے "جمہرات" کے نام سے مختلف شعرا کا کلام جمع کیا ہے چناں چہ ان میں جمہرہ ابوزید انصاری بہت

مشہور ہیں۔ ان میں تقریباً پچاس شاعروں کے کلام سے ایک ایک قصیدہ لے کر ایک مجموعہ مرتب کیا ہے پھر خاص اوصاف کے لحاظ سے ہر حصّے کا جُداگانہ نام رکھا ہے چناں چہ عہدِ جاہلیت کے وہ سات کلیات یہ ہیں :۔

(۱) معلقات (۲) مجمہرات (۳) منتقیات (۴) مذہبات (۵) مراثی (۶) مثنویات (۷) ملحمات۔

یہ مجموعہ تقریباً ۲۹۰ھ میں مرتب کیا گیا اور اس کا نام "جمہرہ اشعار العرب" رکھا۔

محققینِ یورپ کی تحقیقات کے مطابق اس میں جس قدر کلام ہے وہ ۵۰۰ء سے ۶۲۲ء تک کا ہے۔ اور اسی زمانے کو وہ عہدِ جاہلیت سے تعبیر کرتے ہیں کیوں کہ ۶۲۲ء سے اسلام کا آغاز ہوتا ہے اس کے بعد کا کلام زیادہ تر کتبِ ادب، تاریخوں اور تذکروں میں پھیلا ہوا ہے۔

کلامِ جاہلیت کی تدوین جس طریقے سے عمل میں آئی اس سے بہتر طریقہ کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا حقیقت یہ ہے کہ عہدِ عباسیہ کے علماے ادب کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جس پر عربی ادب جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ لیکن افسوس کہ بعض مستشرقین جیسے پروفیسر مارگیولینتھ اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا خیال ہے کہ یہ تمام کے تمام مجموعے بالکل فرضی ہیں اور یہ کلام بعد والوں کی ایجاد ہیں۔ یہ خیال تاریخ اور اصولِ تنقید کے سراسر منافی ہے

اس میں شک نہیں کہ کسی قدر تغیّر اور تبدیلی ضرور ہوئی ہے اور کلامِ جاہلیت میں عہدِ اسلام کے قریب کا زمانہ بھی شامل ہوگیا ہے لیکن جملہ امثال اپنی اصلی حالت پر قائم ہیں اور ان میں مطلق تغیّر نہیں ہوا ہے۔

"استفادات"

اس مقالے میں جن کتابوں سے مدد لی گئی وہ حسبِ ذیل ہیں :۔

۱۔ کتاب الآغانی مصنفہ ابوالفرج اصفہانی
۲۔ کتاب الشعر " محمد بن سلام
۳۔ مقدمۂ ابنِ خلدون
۴۔ تاریخ یعقوبی
۵۔ تاریخ ادبِ عربی پروفیسر نکلسن
۶۔ الیاذہ سلیمان البستانی
۷۔ تاریخ الخضری
۸۔ کتاب الحیوان جاحظ
۹۔ کتاب العمدہ ابن رشیق
۱۰۔ کتاب الشعر والشعراء ابنِ قتیبہ
۱۱۔ جمہرہ انصاری
۱۲۔ تاریخ دول العرب محمد طلعت حرب
۱۳۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جرجی زیدان
۱۴۔ تاریخ علم الادب عند الافرنج والعرب دکتر ہیوگو
(۱۵) شعر الجاہلی ڈاکٹر طٰہٰ حسین
(۱۶) مقدمہ دیوان امراؤالقیس استاد حسن السندوبی
(۱۷) مقالات مجلہ المقتطف وغیرہ۔

مومن کی شاعری پر ایک نظر

(جناب خواجہ احمد صاحب فاروقی ایم اے)

مومن کی شاعری کا پس منظر

سیاسی حالات مومن خاں مومن دہلوی ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا ماحول کئی اعتبار سے اہم ہی۔ اِس وقت سلطنت دہلی کی شمع جھلملا رہی تھی، اور انگریزی تسلط کی بنیادیں مضبوط ہوچکی تھیں۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں فاتحانہ پرچم کے ساتھ دلّی تک پہنچ گئیں اور انگریزوں نے ضعیف العمر شاہ عالم کو جو مرہٹوں کے زیرِ اثر تھا، اپنے قبضے میں کرلیا۔ سرجی ارجن گانو کے صلح نامے کی رو سے سندھیا نے دوآب کا سارا علاقہ معہ آگرہ اور دہلی کے انگریزوں کے سپرد کردیا۔ وہ تیموری جاہ و جلال جس کے آگے ایک زمانے میں شانِ عجم اور شوکتِ روم حقیر معلوم ہوتی تھی، نیست و نابود ہوگیا۔ اور مغلوں کی حکومت سمٹ کر قلعے کی چہار دیواری تک رہ گئی شاہ عالم کے بعد ۱۸۰۶ء میں اکبر شاہِ ثانی مسندِ حکومت پر متمکن ہوا۔ ۱۸۲۷ء میں اس کے مرنے کے بعد بہادر شاہ ظفر جو دُودمانِ تیموریہ کا آخری چشم و چراغ تھا، تخت نشین ہوا۔ اس کی حکومت کی بساط ۱۸۵۷ء کی رستاخیز میں درہم و برہم ہوگئی۔

اِس وقت تا حدِ نظر برطانوی اقتدار کا پرچم لہراتا ہوا نظر آتا تھا۔ ہمارا سیاسی، اخلاقی اور روحانی تنزل انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ قوائے عمل شل ہوچکے تھے۔ اور شعلۂ حیات سرد ہو رہا تھا۔ دست بردِ زمانہ سے اگر کوئی چیز رہ گئی تھی تو صرف اوہام کا تار و پود۔ لوگ مذہب کو دل و جان سے مانتے تو تھے لیکن اس کی اصلی رُوح ختم ہوچکی تھی۔ Stoddard نے جو کچھ اٹھارویں صدی کی اسلامی دُنیا کے متعلق لکھا ہی، وہ انیسویں صدی کے ہندستان کے متعلق زیادہ صحیح ہی:-

مذہبی اور اخلاقی حالات "اٹھارویں صدی عیسویں میں اسلامی دنیا کے ضعف و انحطاط کی انتہا ہوچکی تھی کسی

جگہ اور کسی گوشے میں بھی صحت اور حیات کے آثار نظر نہیں آتے تھے ۔ ہر طرف جمود اور زوال کے بادل چھائے ہوئے تھے ۔ یہی حال مسلمانوں کے عادات وخصائل اور آداب و اخلاق کا تھا ۔ عربی کلچر کے نقوش مٹتے جاتے تھے ۔ امرا "مے و رامش و رنگ و بو" کی دنیا میں مست و خراب تھے ۔ عوام وحشیانہ پستی اور گمراہی میں پڑے ہوئے تھے ۔ تعلیم مُردہ ہو چکی تھی ۔ چند درس گاہیں جو اس ہول ناک زوال میں باقی تھیں، وہ بے توجہی و بے پائی کی وجہ سے دم توڑ رہی تھیں ۔ امرا و رؤسا آزاد اور بے عناں تھے ۔ اس نظامِ مراتب کے نیچے جمہور دبے جا رہے تھے ۔ دیہاتی اور شہریوں میں محنت کے محرکات مفقود تھے ۔ تجارت اور زراعت دونوں سد رمق کے لیے کی جاتی تھیں —— مذہب بھی دوسری چیزوں کی طرح زوال پذیر تھا ۔ محمّد عربی (ص) کی پاک بازانہ توحید پر سفیہانہ توہم پرستی اور پُر اسرار تصوّف کی تہیں جم گئی تھیں ۔ مسجدیں ویران اور سنسان پڑی تھیں ..... عوام تعویذ اور گنڈے پر پورا اعتقاد رکھتے تھے ۔ فقیر اور درویش ہر طرف اپنا اثر جمائے ہوئے تھے ۔ لوگ بزرگوں کی زیارتوں پر جاتے تھے؛ اور ان کی پرستش بارگاہِ ایزدی کے شفیع اور ولی کے طور پر کی جاتی تھی ۔ ان کا خیال تھا کہ خدا ایسا برتر ہے کہ اس کی طاعات بلا واسطہ ادا وسیلہ ہو ہی نہیں سکتیں ۔ احکاماتِ قرآنی کو نظر انداز کیا جاتا تھا اور اکثر ان کے خلاف بھی قدم اُٹھایا جاتا تھا ۔ شراب اور افیون کا استعمال عام تھا زناکاری کا زور تھا اور ذلیل ترین اعمالِ قبیحہ کھلّم کھلّا بے حیائی کے ساتھ کیے جاتے تھے ...... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کی اصلی روح ختم ہو گئی ہے اور صرف بے معنی رسمیات اور مبتذل توہمات باقی ہیں ۔ لوگ توہم پرستی اور رسم پرستی کو اصلِ مذہب سمجھ کر اسی کے گرویدہ تھے ۔" [1]

Dr. Herklot نے "اسلام اِن انڈیا" (۱۸۳۲ء) میں ان رسموں اور تہواروں کا تفصیل سے ذِکر کیا ہے ۔ جو پیر بندہ نواز گیسو دراز زندہ شاہ مدار اور پیر دستگیر کے سلسلے میں منعقد ہوتے تھے ۔ وہ ایک مقام پر لکھتا ہے :-

"مسلمانوں میں مُلکی اور غیر مُلکی عناصر کے ملنے سے بہت سی ایسی رسمیں پیدا ہو گئی ہیں جو اسلام کی روح کے منافی ہیں ۔ سحر اور جادو سے متعلق بہت سی باتیں جو ان کی معاشرت کا جزو بن گئی ہیں، اسی قبیل کی ہیں ۔ مسلمان جاٹ اور راجپوتوں میں شادی ولادت و وفات کی اکثر رسمیں ہندوانہ ہیں ۔ وہ بعض اوقات وراثت میں ہندوؤں کے اصول کی پابندی کرتے ہیں اور مصیبت میں مقامی ہندو دیوتاؤں سے مدد مانگتے ہیں ۔ شمالی

---

[1] World of Islam pp 20-21

مغربی صوبے اور بلوچستان میں بھی جہاں ہندی اثرات بہت کم ہیں، مظاہر پرستی نظر آتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
پیر کو اختیاراتِ کلّی حاصل ہیں، وہ مصیبت کو دُور کرسکتا ہے، بیمار کو اچھا کرسکتا ہے، اولاد بہم پہنچا سکتا ہے اور مُردے کی عاقبت سنوار سکتا ہے" ۵۱

مذہبی اور اخلاقی حالت کا اس سے زیادہ دردناک منظر "سیرتِ سید احمد شہید" کے مولف نے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۲۲ تا ۳۰ - یہاں صرف ایک مختصر سا اقتباس پیش کیا جاتا ہے :-

"سنت و شریعت بے معنی الفاظ تھے، جو صرف کتابوں میں رہ گئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہر بدعت، بدعتِ حسنہ تھی۔ بہت سے حرام، حلال ہوگئے تھے، اور بہت سے حلال، حرام۔ شعائر اُٹھ رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قران و حدیث کے بہت سے احکام منسوخ ہوگئے تھے مثلاً بیوہ کا نکاح اور تقسیم میراث شرفائے اسلام کی نئی شریعت میں مستحب و فرض سے حرام و متروک ہوگئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قران ایک چیستاں تھی جس کو کوئی سمجھ نہیں سکتا تھا نہ اس میں غور کرنے کی ضرورت تھی۔ نہ اس پر عمل کرنے کا سوال تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مسلمانوں سے فاتح اور زندہ قوموں کے خصائص رخصت ہورہے تھے۔ اس درخت کو گھُن لگ گیا تھا۔ امرا و متوسطین سے لے کر غربا تک عیاشی عام تھی اور ہر ایک نشے میں سرشار تھا" ۵۲

پنجاب میں مسلمانوں کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ سکھ انتقام سے بھرے ہوئے تھے۔ اذان بند کردی گئی تھی اور بہت سی مسجدیں ویران پڑی تھیں۔ بادشاہی مسجد، فوجی گودام میں تبدیل ہوگئی تھی ۵۳ موتی مسجد کا نام موتی مندر رکھ دیا گیا تھا۔ سنہری مسجد پر بھی سکھوں کا قبضہ تھا۔ اس کا تمام فرش گوبر سے لپا ہوا تھا۔ امرت سر میں ایک مسجد بھی مسلمانوں کے پاس نہیں تھی۔ کوئی شخص آزادی سے نماز نہیں پڑھ سکتا تھا۔ ۵۴

اصلاحی تحریک ٹھیک اسی زمانے میں مولوی سید احمد بریلویؒ نے اپنی مذہبی اور اصلاحی تحریک شروع کی۔ انھوں نے شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادرؒ سے تعلیم پائی تھی اور کثرت سے لوگ اُن کے مرید و معتقد تھے۔ انھوں نے بلادِ اسلامی میں اپنے خیالات کی اشاعت کی اور ہندستان میں بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنی تحریک کو پھیلایا۔ ۱۸۲۶ء میں انھوں نے مولوی اسماعیل دہلویؒ (صاحبِ تقویۃ الایمان)

---

۵۱ Islam in India. P.8 ۵۲ سیرتِ سید احمد شہید ص ۲۸، ۳۰ -

۵۳ تاریخ لاہور (لطیف) ص ۱۱۵ - ۵۴ The Punjab a Hundred Years ago (Garret) P.27.

کے ہم راہ سکھوں کے خلاف اعلانِ جہاد کیا اور ۱۸۳۱ء میں دونوں جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

مولوی سید احمد بریلوی رح کی مذہبی تحریک جس کو سر سید نے لوتھر کی تحریک سے مشابہ قرار دیا ہے، رفتہ رفتہ انگریزوں کے لیے بھی خطرے کا باعث بن گئی تھی۔ ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر (W. W. HUNTER) نے اپنی کتاب ('OUR INDIAN MUSALMANS') میں اس کی وضاحت کی ہے اور لکھا ہے کہ وہابی مبلغین اُس آبادی کو جو اپنے آئینہ ماضی میں مسلسل غلامی کو نہیں دیکھ سکتی، برابر حکومت کے خلاف برانگیختہ کرتے رہتے ہیں۔

مومن پر ماحول کا اثر مومن نوجوانی ہی میں مولوی سید احمد بریلوی رح کے مرید ہوگئے تھے اس لیے تقلید و بدعت سے سخت نفرت کرتے تھے، ایک رباعی میں فرماتے ہیں ؎

یہ کچھ رہِ سنّت نہ طریقِ توحید پھر کیا ہے سرِ ذرا سب کی یکساں توحید
ہم سمجھے ہیں معنائے حقیقی یعنی حیواں ہیں حقیقت میں یہ اہلِ تقلید

مذہبیت ان کی غزلوں میں بھی یہ صلابتِ دین اور عصبیت موجود ہے ؎

لے نام آرزو کا تو دِل کو نکال لیں مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

ایک اور جگہ اپنے مذہبی خیالات بڑے جوش سے بیان کیے ہیں ؎

اربابِ حدیث کا میں فرماں بر ہوں تقلید کے منکروں کا سردفتر ہوں
مقبول روایتِ ائمہ نہ قیاس یعنی کہ فقط تابعِ پیغمبر ہوں

مومن کو مولوی سید احمد بریلوی رح سے دلی عقیدت اور محبت تھی۔ ایک مثنوی میں لکھتے ہیں :-

وہ خضرِ طریقِ رسولِ خدا کہ جو پیرو اس کا ہے سو پیشوا
وہ نورِ مجسم وہ ظلِّ الٰہ کہ سائے سے جس کے خجل مہر و ماہ
زہے سید احمد قبولِ خدا سرِ امتحانِ رسولِ خدا

مومن مولوی سید احمد بریلوی رح کو "مہدیٔ دوراں" سمجھتے تھے ؎

گلابِ ناب سے دھوتا ہوں مغزِ اندیشہ کہ فکرِ مدحتِ سبطِ قسیم کوثر ہے
وہ کون امامِ جہان و جہانیاں احمد کہ محض مقتدیٔ سنّتِ پیمبر ہے

وہ شاہِ مملکت ایماں کہ جس کا سالِ خروج
"امام برحق مہدیٔ نشاں علی فر" ہے
۱۲۴۲ ہجری

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں ؎

شوقِ بزمِ احمد و ذوقِ شہادت ہے مجھے
جلد مومن لے پہنچ اس "مہدیٔ دوراں" تلک

غیر ملکی حکومت سے نفرت

مومن کی یہ مذہبیت جب بلند سطح پر پہنچ جاتی ہے تو وہ غیر ملکی حکومت سے نفرت اور بیزاری کا سبب بن جاتی ہے۔ ان کی وارستگیٔ مزاج اور مولوی سید احمد بریلویؒ اور مولوی اسماعیل دہلویؒ کی صحبت کا مقتضا بھی یہی تھا۔ انھوں نے ایک قصیدہ عرفی کے طرز میں لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں ؎

ایں عیسویاں بلب رسانند
جانِ من و جانِ آفرینش

تا چند بہ خوابِ ناز باشی
فارغ ز فغانِ آفرینش

مومن شدہ ہم زبانِ عرفی
از بہرِ امانِ آفرینش

برخیز کہ شورِ کفر برخاست
اے فتنہ نشانِ آفرینش

مومن کی آسودہ حالی اور مذہبیت نے اُن کے اندر خودداری اور استغنا کی شان پیدا کردی تھی اُن کے یہاں نہ ذوق کی سی لابہ گری ہے اور نہ غالب کا سا "تاخدا باشد بہادر شاہ باد" والا اندازِ بیان، نہ انگریز حکام کی ثنا گستری اور چاپلوسی۔ اس کے برخلاف وہ مثنوی جہادیہ میں لکھتے ہیں ؎

جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا
فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا

حبیبِ حبیبِ خداوند ہے
خداوند اس سے رضامند ہے

امامِ زمانہ کی یاری کرو
خدا کے لیے جاں نثاری کرو

آخر میں دعا کرتے ہیں ؎

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

الٰہی اگرچہ میں ہوں تیرہ کار
پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار

تو اپنی عنایت سے توفیق دے		عروجِ شہید اور صدیق دے

اسی مضمون کو ایک رباعی میں بیان کیا ہے ؎

مومن تمھیں کچھ بھی ہے جو پاسِ ایماں		ہے معرکۂ جہاد چل دیجیے وہاں
انصاف کرو، خدا سے رکھتے ہو عزیز		وہ جاں جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں

ان مضامین کو دیکھ کر اگر مومن کو مسلمانانِ ہند کا پہلا قومی شاعر کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔

مومن کی سیرت

مومن عربی میں شاہ عبدالقادرؒ کے شاگرد تھے اور شاہ عبدالعزیزؒ کی مجالسِ وعظ کے حاشیہ نشین۔ وہ مولوی سید احمدؒ کے مرید تھے اور مولوی اسماعیلؒ کے ہم سبق۔ ان کی شادی دہلی کے نام ور خاندانِ ارشاد و ہدایت یعنی خواجہ دردؒ کے گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس لیے خوشامد و تملّق ان میں نام کو بھی نہیں تھا۔ خودداری اور استغنا کی شان نمایاں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے حمد و نعت و منقبت کے سوا کسی امیر یا رئیس کی تعریف نہیں کی۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ امرا و رؤسا تو درکنار وہ اساتذۂ سلف کی تعریف کرنا اور سُننا پسند نہیں کرتے تھے۔ قصیدے کو انھوں نے ہمیشہ "کار ہوس پیشگاں" سمجھا۔ فارسی دیوان میں لکھتے ہیں ؎

بادشاہا بہ ایں متاعِ قلیل		مدح چوں از منے چرا خواہی
دیگراں دیگر اند و من دیگر		ہرچہ از بوم از ہما خواہی

مومن نے شاعری اور طبابت کو کبھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔ ٹامسن صاحب نے اسیؔ روپے کی پروفیسری دینا چاہی، انھوں نے انکار کر دیا۔ ریاست کپورتھلہ نے ۳۵۰ روپے پر بُلانا چاہا، نہ گئے۔

انیسویں صدی کی معاشرت بھی عجیب تھی۔ وہ مومن جو "ہجرِ پردہ نشیں" میں مرتا ہے، جو "شبِ وصلِ غیر" کاٹنے پر آمادہ ہے اور جو "کوچۂ رقیب" میں بھی سر کے بَل جانے کے لیے تیار ہے، وہی مومن یہ دُعا کرتا ہے ؎

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب		یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں		مری جاں فدا ہو تری راہ میں

اس زمانے میں ہماری زندگی خانوں میں بٹی ہوئی تھی ۔ رندی و مذہبیت ایک ساتھ چلتی تھیں ۔ اِن میں اتنا تضاد نہیں تھا جتنا آج نظر آتا ہی ۔ زندگی عشقِ مجازی سے شروع ہوتی تھی اور بعض صورتوں میں وہ عشقِ حقیقی کا زینہ بن جاتی تھی ۔ مومن حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے، نجبائے کشمیر سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا گھرانا بادشاہی طبیبوں اور شہر کے معزز لوگوں میں شمار ہوتا تھا ۔ مومن نے اس زمانے کے طریق کے مطابق عربی و فارسی میں مہارتِ تامہ پیدا کی ۔ جوانی ہی میں مرید ہوگئے ۔ فنِ طب اپنے باپ اور چچا سے حاصل کیا ۔ شاعری، علمِ نجوم، شطرنج، تاریخ گوئی میں کمال پیدا کیا ۔ لیکن اسی کے ساتھ دادِ عیش بھی خوب دی اور جوانی کا زمانہ ہوس ناکی میں گزارا ۔ وہ نہایت خوب صورت، جامہ زیب، خوش گلو، خوش وضع اور عاشق مزاج آدمی تھے ۔ دلّی ان کی جولان گاہ تھی ۔ جب جوانی کی ہوس ناکی ختم ہوگئی تو انھوں نے تمام بُری باتوں سے توبہ کرلی اور نماز روزے کے پابند ہوگئے ۔

اسلوب ان سب باتوں نے مومن کے اسلوب کی تعمیر میں مدد دی ہی ۔ ان کے یہاں دو طرز بہت نمایاں ہیں؛ ایک پیچیدہ ہی دوسرا سادہ اور دونوں اُن کے اصلی اور حقیقی رنگ ہیں ۔ پیچیدگیِ کلام کا سبب مومن کی بڑھی ہوئی علمیت ہی ۔ لیکن غالباً اصلی وجہ جدت طرازی اور انفرادیت ہی ۔ وہ روشِ عام سے الگ رہنا چاہتے تھے ممکن ہی اس کا نفسیاتی سبب عشق کی پردہ داری بھی ہو ۔ اس کے علاوہ مومن کی شاعری نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، اس میں بھی دو ذہنیتیں بنتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں ۔ ایک طرف خیالات و واردات اور معنویت پر زور دیا جارہا تھا ۔ دوسری طرف زبان، رعایتِ لفظی اور خارجی پہلو پر ۔ غالب اور آتش کے یہاں پہلا طرز نمایاں ہی اور ذوق، نصیر اور ناسخ کے یہاں دوسرا ۔ مومن کے یہاں یہ دونوں رجحانات پائے جاتے ہیں ۔ کہیں آکر مل گئے ہیں اور کہیں الگ الگ ہیں ۔ لیکن ان کی استادی اور انفرادیت ہر جگہ نمایاں ہی

مومن نے چند روز شاہ نصیر (ناسخ دہلی) کو اپنا کلام دکھلایا تھا اور جب ناسخ کا دیوان دہلی پہنچا تو اس کا تتبع بھی کرنے کی کوشش کی اور اس قسم کے اشعار کہے سے

لے اڑی لاشہ ہوا لاغر زبس تن ہوگیا	ذرّۂ ریگِ بیاباں اپنا مدفن ہوگیا

لیکن بعد میں ان کی جدت پسند طبیعت نے ایک علاحدہ رنگ اختیار کرلیا جس میں رشک آمیز سوز، داخلیت اور خارجیت کا لطیف امتزاج، تخیّل کی وسعت اور بیان کی لطافت بہ درجۂ اتم موجود ہی ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہی

مومن کی خصوصیات

(۱) مومن کے یہاں نکتہ یابی اور نازک خیالی کا کمال نظر آتا ہے۔ بات میں بات پیدا کرنا اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے مثلاً ؎

دیکھ اپنا حالِ زار منجّم ہوا رقیب　　　تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا

(یعنی منجّم نے نجوم کے ذریعے عاشق کی محرومی اور بدبختی کا پتا لگا لیا۔ اور اس کی ناکامیابی سے اپنی کامیابی کی توقعات پیدا کرلیں۔ اس طرح منجّم عاشق کا رقیب بن گیا اور عاشق کا بختِ ناساز، منجّم کے حق میں سازگار ثابت ہوا)

یا ؎　　پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے　　　اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے

یا ؎　　تھا مقدر میں اس سے کم ملنا　　　کیوں ملاقات گاہ گاہ نہ کی

یہ اصل میں فغانی و شفائی کا طرز ہے، جسے عرفی و نظیری نے ترقی دی اور کلیم و بیدل نے انتہا کو پہنچا دیا۔ مومن کو فارسی سے طبعی مناسبت تھی۔ ان کی اُستادی کی بنیاد بھی ایک حد تک اسی دستگاہِ فارسی پر قائم ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ان کا یہ طرز فارسی پسندی کا لازمی نتیجہ ہے۔

(۲) فارسی ہی کے اثر سے مومن کے یہاں ایسی لطیف ترکیبیں پائی جاتی ہیں، جو شعر کی جان ہیں مثلاً ؎

بدنام میرے گریۂ رسوا سے ہو چکے　　　اب عذر کیا رہا نگہِ بے حجاب میں

مطلب کی جستجو نے یہ کیا حال کردیا　　　حسرت بھی اب نہیں دلِ ناکام یاب میں

گریۂ رسوا اور دلِ ناکام یاب کی ترکیبوں نے ان اشعار کی معنویت اور تاثیر کو دوبالا کر دیا ہے۔ ایسے ہی ؎

غیر سے سرگوشیاں کرلیجیے پھر ہم بھی کچھ　　　آرزوہائے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہیں

یا ؎　　امتحاں کے لیے جفا کب تک　　　التفاتِ ستم نما کب تک

یا ؎　　کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم　　　کہیں پامال سر نہ ہوجائے

التفاتِ ستم نما، اور پامال سر کی تراکیب نے بہت وسیع مفہوم کی گنجایش پیدا کردی ہے۔

غرض، آرزوہائے دلِ رشک آشنا، چشمِ ستارہ بار، آہوے نیم خواب، شکوۂ زخم ریز اور اسی قسم کی بیسیوں استوار اور خوش نما ترکیبوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کی طبیعت فارسی مذاق سے بہ خوبی آشنا تھی اور یہ مرصّع کاری اسی کا فیضان ہے۔

(۳) مومن نفسیاتی اُمور کو سامنے رکھ کر شاعری کرتا ہے۔ بعض جگہ اسی وجہ سے فطریت اور درد و اثر کی فراوانی نظر آتی ہے۔ محبوب کو فکرِ جور سے باز رکھنا چاہتا ہے تو کہتا ہے ؎

دن رات فکرِ جور میں یوں رنج اُٹھانا کب تلک　　مَیں بھی زرا آرام لوں، تم بھی زرا آرام لو

مَیں بھی "زرا آرام لوں" کا ٹکڑا محض گمانِ بد رفع کرنے کے لیے ہے یہی وجہ ہے کہ اس جزو نے استدعائے عاشق کا نفسیاتی اثر بڑھا دیا ہے۔

بعض اوقات مومن اپنا مطلب اس نفسیاتی طریقے سے ادا کرتا ہے کہ بہ ظاہر اپنا فائدہ نہیں معلوم ہوتا۔ مخاطب خود اپنا فائدہ تصوّر کرتا ہے مثلاً ؎

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں　　اتنا رہا ہوں دُور کہ ہجراں کا غم نہیں

وہ بدخواہ مجھ سا تو میرا نہیں　　عبث دوستی تم کو دُشمن سے ہے

ہے دوستی تو جانبِ دُشمن نہ دیکھنا　　جادُو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

پروفیسر ضیا احمد بدایونی نے اس طرز کا نام مکرِ شاعرانہ رکھا ہے لیکن یہ حقیقتاً نفسیاتی اسلوب ہے جو معشوقِ عاشق پیشہ کے لیے نہایت موزوں ہے۔ اس میں عاشقانہ عجز اور بلند فتادگی کچھ اس طرح شامل ہے کہ بتِ سنگ دل بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مومن نے شعور و وجدان سے بھی کام لیا ہے اور مُونیلے شعر و نفسیات میں ان دونوں چیزوں کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ظاہر ہے مثلاً ؎

کچھ قفس میں اِن دنوں لگتا ہے جی　　آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

کیا دِل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا　　کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

ہو نہ بے تاب ادا تمھاری آج　　　کچھ تو کہتی ہو بے قراری آج

(۴) مومن کی شاعری میں "کوچہ گردی کی بو" آتی ہو۔ اس کا معشوق "جنسِ کم ارز" سے تعلق رکھتا ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس کی واقعہ گوئی اور معاملہ بندی جرأت و انشا سے بلند ہو۔ اس نے اسلوب کی ندرت اور پاکیزگی سے اپنے کلام پر ابتذال اور عریانی کا دھبا نہیں آنے دیا ؎

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں　　　سارے گلے تمام ہوے اِک جواب میں

چینِ جبیں کو دیکھ کے دِل بستہ تر ہوا　　　کیسی کشودِ کار ،کشاد نقاب میں

یارب وصالِ یار میں کیوں کر ہو زندگی　　　نکلی ہی جان جاتی ہو ہر ہر ادا کے ساتھ

(۵) اسی سلسلے میں ایک بات اور قابلِ لحاظ ہو۔ مومن کا معشوق ضرور بازاری ہو لیکن اس کا عشق بازاری نہیں ہو۔ اس کے عشق میں خودداری ہو اور فتادگی میں بلندی۔ وہ کوئی ایسا مطالبہ نہیں کرتا جو عاشقی و محبوبی کے خلاف ہو یا حُسن و عشق کے مرتبے سے گرا ہوا ہو۔ مثلاً ؎

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خوابِ ناز میں　　　ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں

جانے دے چارہ گر شبِ ہجراں میں مت بُلا　　　وہ کیوں شریک ہو مرے حالِ تباہ میں

مرے تغیّرِ رنگ کو مت دیکھ　　　تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

مومن اپنے محبوب کو ملزم نہیں ٹھیراتا ؎

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہو　　　اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہو

اگر وہ اپنی محرومی اور حرماں نصیبی کا ذکر کرتا ہو تو عشق کی پوری نیاز آگینی کے ساتھ ؎

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے　　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

مرچک کہیں کہ تو غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے کہتے تو ہیں بھلے کی وہ لیکن بُری طرح

(۶) مومن کا معشوق جنسِ لطیف سے تعلق رکھتا ہے۔ اس قسم کے اشارے جا بہ جا اُن کے کلام میں ملتے ہیں سے

ہجرِ پردہ نشیں میں مرتے ہیں زندگی پردہ در نہ ہو جائے

لیکن تمام کلام "عشقِ حلال کا مرقع" نہیں ہے۔ اس قسم کے اشعار بھی ملتے ہیں سے

دلِ مومن آتش کدہ کیوں بنے لگاوٹ یہ طفلِ برہمن سے ہے

لیکن یہ ان کا عام رنگ نہیں ہے۔

(۷) مومن کی شاعری کا محور جذبۂ رشک اور ذکرِ غیر ہے لیکن اس نے جرأت اور انشا کی طرح کوئی بات خلافِ تہذیب نہیں لکھی اور کسی جگہ بھی فتادگیٔ عشق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

مومن کی شاعری میں جذبۂ رشک کی فراوانی کی نفسیاتی وجہ اس کی غیرت و حمیّت ہے۔ مثلاً

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

یہ جذبۂ رقابت، بے حمیتی نہیں بلکہ عینِ غیرت و حمیّت ہے سے

ہے نگاہِ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے

یہ رشک بھی ملاحظہ ہو جس نے نامہ بر کو راہ بر بنا دیا ہے۔ سے

رشکِ پیغام عناں کشِ دل ہے نامہ بر راہ بر نہ ہو جائے

مومن کے اس بدنام شعر میں سے

اے شبِ وصل غیر بھی کاٹی تو مجھے آزمائے گا کب تک

اظہارِ کرب کے ساتھ، الفاظ میں جو روک تھام ہے وہ تعریف سے مستغنی ہے۔

(۸) مومن توجیہہ خوب کرتا ہے۔ شبِ فراق میں مرنے کی خواہش بالکل فطری بات ہے لیکن وہ کہتا ہے سے

شبِ فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں کہ گو خوشی نہیں ملنے کی پر ملال تو ہے

میں جانتا ہوں نعش پہ آنے کا مدعا آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

ایسے ہی تجاہلِ عارفانہ کی مثالیں اس کے یہاں کثرت سے ملیں گی سے

تارے آنکھیں جھپک رہے تھے تھا بام پہ کون جلوہ گر رات

اِس تجاہل سے محبوب کے رُخِ روشن میں مبالغہ منظور ہے۔

(۹) مومن کو جمعِ تضاد میں کمال حاصل ہے ؎

ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا

آخر امید ہی سے چارۂ حرماں ہوگا مرگ کی آس پہ جینا شبِ ہجراں ہوگا

مومن لفظی ہیر پھیر سے تخئیل کے لیے نئی راہیں کھول دیتا ہے ؎

کیوں غش ہوئے دیکھ آئینے کو کہتے تھے کہ تاب لائیں گے ہم

آئینہ زنگِ غم نے توڑا کیوں کر اسے منھ دکھائیں گے ہم

(۱۱) مومن کے یہاں محذوفات غالب سے زیادہ ہیں۔ بعض اوقات وہ بات کو پیچ سے بیان کرتے ہیں، لیکن اس میں بڑی لطافت پوشیدہ ہوتی ہے۔ چند الفاظ میں ایک وسیع مضمون کو حُسن و خوبی کے ساتھ بیان کردینا مومن کی سب سے بڑی خصوصیت ہے مثلاً ؎

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

رشکِ دشمن بہانہ تھا، سچ ہے میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

وہ مسلّمات کو سمجھنے والے پر چھوڑ دیتے ہیں اور صرف ضروری ٹکڑوں کا اظہار کر دیتے ہیں مثلاً ؎

تھی نوحہ زنی دل کے جنازے پہ ضروری شاید کہ وہ گھبرا کے سرِ بام نکلتا

ذکرِ اغیار سے ہوا معلوم حرفِ ناصح بُرا نہیں ہوتا

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

(۱۲) مومن کے کلام میں صحتِ بیانی بہ درجۂ اتم موجود ہے ؎

کیا گل کھلے گا دیکھیے ہے فصلِ گل تو دور اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

کیا دِل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

کچھ کچھ درست ضد سے تری ہو چلے ہیں وہ
یک چند اور کج روی اے آسمان نہ چھوڑ

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دُوسرا نہیں ہوتا

(۱۳) مومن کو جذبات اور واردات بیان کرنے میں امتیاز حاصل ہے

نہ ربط اس سے نہ یاری آسماں سے
جفا بہرِ عدو لاؤں کہاں سے
وہ آئے ہیں پشیماں لاش پہ اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

یارب وصالِ یار میں کیوں کر ہو زندگی
نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا

(۱۴) مومن کے کلام میں شوخیٔ ادا کی بھی مثالیں ملتی ہیں

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی
ناصح یہ بندِ غم نہیں، قیدِ حیات ہے
بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں
کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے
ہم حال کہے جائیں گے سُنیے کہ نہ سُنیے
اتنا ہی تو یاں صحبتِ ناصح کا اثر ہے
لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شبِ فراق
ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

(۱۵) مومن کے آرٹ کا کمال طنز نگاری میں نظر آتا ہو۔ اس کے طنز کا نشتر براہ راست رگِ جان پر اثر کرتا ہو ؎

رحم فلک اور مرے حال پر توُ نے کرم اے ستم آرا کیا

کیا پسند آئی اپنی جور کشی چرخ کے انتخاب نے مارا

خنجر تو نہ توڑ سخت جانی پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم

(۱۶) مومن جب دِقت اور پیچیدگی کو چھوڑ کر سہلِ ممتنع پر آجاتا ہو تو سادگی، روانی اور سوز و اثر کا دریا بہا دیتا ہو ؎

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو عذر کچھ چاہیے ستانے کو

صبح عشرت ہو وہ نہ شامِ وصال ہائے کیا ہوگیا زمانے کو

برق کا آسمان پر ہو دماغ پھونک کر میرے آشیانے کو

یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا رنج راحت فزا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا

چارۂ دِل سوائے صبر نہیں سو تمھارے سوا نہیں ہوتا

حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر ہاتھ دِل سے جُدا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

رحم فلک اور مرے حال پر توُ نے کرم اے ستم آرا کیا

---

(۱۷) نیاز فتح پوری نے لکھا ہو کہ "رنگِ تغزل میں مومن کا کلام اس غیر تغزلانہ چیز سے بالکل پاک ہو جس کو تصوف یا عشقِ حقیقی سے موسوم کیا جاتا ہو۔" پروفیسر ضیاء احمد کا بھی تقریباً یہی خیال ہو۔ انھوں نے لکھا ہو کہ "مومن نے فلسفے یا مابعد الطبیعیات کی وادیوں میں قدم نہیں رکھا۔" ہمارا خیال ہو کہ مومن کے یہاں تصوف، فلسفے اور اخلاق کے مضامین ہیں لیکن کم۔ زیادہ تر اسی مادی عشق کے تجربات اور واردات بیان کیے ہیں۔ اِس اعتبار سے کہا جاسکتا ہو کہ مومن کا کلام صحیح رنگِ تغزل کا حامل ہو اور اس نے غزل کے "ابتدائی" مفہوم کو سامنے رکھا ہو اور رازگفتن بہ معشوق کا حق ادا کردیا ہو۔ وہ خود کہتا ہو ؎

مومن بہشت و عشقِ حقیقی تمھیں نصیب　　ہم کو تو رنج ہو جو غمِ جاوداں نہ ہو

(۱۸) مومن کی بعض غزلوں میں واسوخت کا رنگ غالب ہو ؎

اب اور سے لَو لگائیں گے ہم　　جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم
بُت خانۂ چین ہو گو ترا گھر　　مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

(۱۹) مومن نے اپنے تخلص سے ہر جگہ فائدہ اُٹھایا ہو ؎

جنّت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے　　جورِ اجلِ تفرقہ پرداز تو دیکھو
نام عشقِ بتاں نہ لو مومن　　کیجیے بس خدا خدا صاحب
مومن تم اور عشقِ بُتاں اِی پیر و مرشد خیر ہو　　یہ ذکر اور منھ آپ کا، صاحب خدا کا نام لو

معائبِ مومن

(۱) مومن نے بعض جگہ صحتِ زبان کا خیال نہیں رکھا ہو۔ اس کا اصلی سبب ان کی بے پروائی ہو، ناواقفیت نہیں۔

(۲) بعض اشعار میں تعقیدِ لفظی و معنوی ہو مثلاً ؎

جوں نکہتِ گُل جنبش ہو جی کا نکل جانا　　اِی بادِ صبا میری کروٹ تو بدل جانا

پہلے مصرع کے دو ٹکڑے ہوسکتے ہیں۔ شانِ اُستادی یہ ہو کہ دونوں ٹکڑوں کے الفاظ الگ الگ رہیں، لیکن اس

شعر میں "جنبش" پہلے ٹکڑے کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ حالاں کہ اس کا تعلق دوسرے ٹکڑے یعنی "ہر جی کا نکل جانا" سے ہے۔ کبھی جملے کا ایک ٹکڑا ایک مصرع میں اور دوسرا ٹکڑا دوسرے مصرع میں لاتے ہیں۔ مثلاً ؎

بے حجابی کا گلہ کیجے تو کہتا ہے ترے　　　پردۂ چشم کی تقصیر کہ حائل نہ ہوا

(۳) تلمیحاتِ بعیدہ کی کثرت ہے مثلاً اس شعر میں ؎

جلتا ہوں اہلِ نار کی تبدیلِ جلد سے　　　مومن غضب ہے آتشِ لذت فزائے داغ

بدلنا هم جلوداً غیرها کی طرف اشارہ ہے۔

(۴) غزل ان کی بڑھی ہوئی علمیت کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتی۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

صبح دم آنے کو تھا وہ کہ گواہی دے ہے　　　رجعتِ قہقہریٔ شمس و قمرِ آخرِ شب

قرانِ انجمِ سیارہ برجِ آبی میں　　　ڈبوئے گی مری چشمِ ستارہ بار مجھے

(۵) بعض جگہ محذوفات کی زیادتی اور مسلمات سے انحراف کی وجہ سے پیچیدگی اور مُعمائیت پیدا ہوگئی ہے۔

(۶) مومن کی دنیا تنگ ہے اور اس کا میدان محدود۔ جو کمال دکھلایا ہے وہ "تنگ نائے غزل" میں اور اس کے بھی چند مضامین خاص طور پر لیے ہیں۔

مومن کا اثر شعرائے مابعد پر

مومن نے شعرائے مابعد پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود جو کچھ نظر آتی ہے وہ ایک معنی کر مومن ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اُن کے مقلدین میں شیفتہ، حالی، نسیم، تسلیم، تسکین اور حسرت موہانی کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔

شیفتہ کے اکثر اشعار طرزِ مومن میں ہیں ؎

یاں سبک حرفِ ملامت، واں گراں عرضِ نیاز　　　سخت جاں ہیں کب نہ تھا اور نازنیں تو کب نہ تھا

کب ہمیں حاجتِ پرہیز پڑی　　　غم نہ کھایا تھا کہ سم یاد آیا

اس سے ہمیں شکوے کی جا شکرِ ستم کر آیا کیا کروں تھا مرے دل میں سو زباں پر آیا
میرے آنے سے تم اُٹھ جاتے ہو بزمِ دشمن میں نہ آؤں کیوں کر

شیفتہ کے کلام میں بھی مومن کی سی ہموار اور خوش گوار ترکیبیں پائی جاتی ہیں مثلاً: اشکِ گل ریز، خراشِ ناخنِ غم، مطرب جادو ترانہ، ظنِ نیم ستم، دلِ شورش ادا، مستیٔ نیم خام، شوقِ غلط کار، توبۂ ژولیدہ۔

حالی نے بالواسطہ مومن سے استفادہ کیا ہے۔ خود فرماتے ہیں ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

حسرت موہانی نے جا بجا پیرویٔ مومن کا ذکر کیا ہے ؎

حسرت یہ وہ غزل ہے جسے سن کے سب کہیں مومن سے اپنے رنگ کو تونے ملا دیا

طرزِ مومن پہ مرحبا حسرت تری رنگیں نگاریاں نہ گئیں

حسرت کی شاعری میں نفسیاتی واقفیت اور حسن و عشق کے گوناگوں پہلو ملتے ہیں۔ ان کا سرچشمہ بھی ایک معنی میں مومن ہی کا کلام ہے۔ پچھلے بیس سال کے اندر ہزاروں نئی ترکیبیں وضع کی گئیں جو شاعرانِ نو کی جدتِ پنہاں کی غمازی کرتی ہیں۔ اس کی مثالیں بھی مومن اسکول میں زیادہ ملیں گی۔ حسرت کا کلام اس کا شاہد عادل ہے ؎

سرگرمِ ناز آپ کی شانِ جفا ہے کیا باقی ستم کا اور ابھی حوصلہ ہے کیا
اک برقِ مضطرب ہے کہ اک سحرِ بے قرار کچھ پوچھیے نہ وہ نگۂ فتنہ زا ہے کیا

مومن کے فکر و تخئیل نے اُردو غزل کو بے حد متاثر کیا ہے۔ اس کی شاعری اور زندگی میں ایک لطیف ہم آہنگی ہے اسی لیے اس کی مہذب غزلیت آج بھی لطف دیتی ہے اور شاعرانِ عصرِ حاضر کے لیے شمعِ راہ بنی ہوئی ہے۔ مومن کی غزل بے جان نہیں ہے اس میں زندگی تازگی اور ندرت ہے۔

تبصرے

ادبیات

نادراتِ شاہی (مرتبہ مولوی امتیاز علی خاں عرشی صاحب ناظم کتاب خانہ ریاست رام پور)

یہ شاہ عالم بادشاہ کے اُردو، فارسی، ہندی اور پنجابی اشعار کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ کتاب خانۂ ریاست رام پور میں ہے جو نواب خلد آشیاں کے عہد میں نواب مرزا خاں داغ مرحوم کی معرفت خریدا گیا تھا۔ مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتاب خانے نے بڑے سلیقے سے اسے مرتب کیا ہے اور شروع میں ایک مبسوط دیباچہ لکھا ہے جس میں شاہ عالم بادشاہ کے حالات اور اُن کے کلام پر تبصرہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا نام ”نادراتِ شاہی“ خود بادشاہ نے تجویز کیا تھا۔

اس مجموعے میں اُردو کی کل ۴۷ غزلیں ہیں اور ہر غزل میں پانچ شعر ہیں۔ شاہ عالم بہت پُرگو تھے۔ یہ ان کے کلام کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ عرشی صاحب نے اُس اُردو دیوان کا بھی ذکر کیا ہے جو ڈاکٹر اشپرنگر کی فہرست میں درج ہے۔ جس میں ۲۴۴ صفحے تھے اور ہر صفحے میں آٹھ سطریں تھیں اور اب نایاب ہے۔ نیز بہار ری سرچ سوسائٹی، برٹش میوزیم لندن اور میونخ لائبریری کے نسخوں کا ذکر ہے یہ سب بہت مختصر نسخے ہیں۔ تعجب ہے کہ کتب خانۂ آصفیہ (حیدرآباد دکن) کے نسخے کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا حالاں کہ بادشاہ کے کلام کا بہت ضخیم کلیات ہے اور خوش خط لکھا ہوا ہے۔

ان ۴۷ غزلوں کے بعد متفرق ہندی کلام ہے۔ ہر صفحے میں دو دو تین تین شعر ہیں۔ سارا کلام اُردو ہندی دونوں رسم خط میں ہے۔ فارسی کی صرف دو غزلیں پانچ پانچ شعر کی اور چھ مختلف شعر ہیں۔

کلام معمولی ہے۔ کتاب بہت اچھے نسخ ٹائپ میں چھپی ہے۔ آخر میں اختلافِ الفاظ اور اشاریہ کے دو ضمیمے بھی ہیں۔

ادبی مقالات | بہ قلم جناب بشیر علی صاحب صدیقی، ایم اے، معلم گورنمنٹ ہائی اسکول، ہاتھرس۔ شائع کردہ: شاہ اینڈ کمپنی، وصی روڈ، آگرہ۔ درسی کتب کی تقطیع، ۱۶۴ صفحات پر مجلّد، منقش گردپوش کے ساتھ شائع کی گئی ہو۔ کاغذ، لکھائی چھپائی معمولی۔ قیمت عہ

اصل میں یہ اُن مضامین کا مجموعہ ہو جو صدیقی صاحب نے مختلف ادبی عنوانات پر تحریر کیے اور وقتاً فوقتاً اُردو رسائل میں چھپتے تھے۔ شروع میں آل احمد صاحب سرور اُستاد مسلم یونی ورسٹی کا تعارف شامل ہو جس میں ہمارے تنقیدی ادب پر ایک متین و مختصر تبصرہ کیا گیا ہو۔

اقبال، حالی، سودا، نذیر احمد اور مولانا احسن مارہروی پر صدیقی صاحب کے مضامین کافی دلچسپ اور طلبہ کے لیے ضرور مفید ہوں گے۔ تذکرۂ آبِ حیات، اُردو کی ابتدا اور ہندی اُردو کے تفیے پر بھی الگ الگ مقالات ہیں مگر مضمون کی وسعت کے اعتبار سے یہ کسی قدر تشنہ رہ گئے ہیں۔ حال آں کہ فاضل موٓلف نے اقبال کے تصورِ شیطان پر خاصی موشگافی اور جزئیات نگاری کی ہو جس سے گمان ہوتا ہو کہ شاید وہ اسے رند مزاج شاعروں کے تفنن اور آزاد مشرب صوفیوں کی خیال آرائی کی بجائے واقعی کوئی سنجیدہ موضوع سمجھتے ہیں۔

'اُردو مزاح نگاری' کے مقالے میں لائق موٓلف نے رشید احمد صاحب صدیقی کو (جو غالباً موٓلف کے اُستاد ہیں) خراجِ تحسین کے ساتھ یہ سرٹیفکیٹ بھی دے دیا ہو کہ وہ ایک ناکام یاب پروفسر ہوں تو ہوں، ایک کام یاب مزاح نگار ضرور ہیں! (ص ۶۵)

فاضل مقالہ نگار حالی کے معتقدین یا متبعین میں شامل ہیں جس کی سرور صاحب نے بھی اپنے تعارف میں تصدیق کی ہو۔ مگر یہ دیکھ کر ہمیں سخت حیرت ہوئی کہ ایک مضمون میں جہاں حالی کی "برکھا رُت" کو انھوں نے اُردو کی ایک یادگار نظم قرار دیا ہو وہاں اس کے مقابلے میں نظیر اکبرآبادی اور ایک زمانۂ حال کے شاعر کے بعض چوپولے نقل کرکے 'برکھا رُت' کے برابر بلکہ بہتر ہونے کا اشارہ کرتے ہیں! 'برکھا رُت' حالی کی نہایت سلیس و شیریں بیانیہ نظم ہو۔ پہلی مرتبہ لاہور کے مشاعرے میں پڑھی گئی تو کہا جاتا ہو کہ اُن کے بعض نامی حریف بھی خود اپنی نئی شاعری سے بیزار نظر آنے لگے تھے۔ اُسے نظیر کی

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہی ادمس

پامال کی کسی ایسی نظم سے ٹکرانا کہ جس کے ہر بند سے آورد اور فکر کی بے ربطی اور افلاس ٹپکتا ہی[1] کمال بے دردی یا بدمذاقی سمجھا جائے تو ہمیں ذرا بھی تعجب نہ ہوگا۔

کتاب کے آخر میں ایک مضمون جدید انگریزی شاعری پر شامل ہی اور اس میں بعض انگریزی نظموں کے ترجمے بھی دیے گئے ہیں۔

لائق مولف کا ایک دل چسپ تسامح یہ نظر آیا کہ جنوری سنہ ۴۱ء کے ایک مضمون میں اصرار کرتے ہیں کہ حضرت مرزا مظہر جانِ جاں رحمۃ اللہ علیہ کو جان جاناں لکھنا درست نہیں مگر ایک آیندہ مضمون میں جس پر اکتوبر سنہ ۴۱ء کی تاریخ درج ہی خود بھی جابجا جان جاناں ہی تحریر فرماتے ہیں (ص ۱۱۴، ۱۱۵)۔ کتاب میں اقتباسات اور دوسروں کے اقوال کو بھی احتیاط کے ساتھ واوین میں یا علاحدہ نمایاں نہیں کیا گیا ہی جس سے بعض اوقات غلط فہمی پیدا ہوتی ہی۔

مجموعی طور پر یہ مجموعہ اربابِ شوق اور خصوصاً اُردو ادب کے طلبہ کے پڑھنے کے لائق ہی۔ (س)

تصحیح کتاب "تعلیم کے نئے اصول" پر رسالۂ 'اُردو'، بابت جولائی سنہ ۴۵ء میں تبصرہ شائع ہوا ہی۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ کتاب کی قیمت درج نہیں۔ اب جناب مولف تحریر فرماتے ہیں کہ قیمت عصہ، مقدمۂ کتاب کے بعد کے صفحے پر درج ہی۔ ملنے کا پتا: سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ، اڈیٹر 'رہنمائے تعلیم'، لاہور، ہی۔ یہ دونوں باتیں تبصرہ نگار صاحب کی نظر سے نہیں گزریں۔ اب اس کی صحت کردی جائے۔

---

[1] اس نظم کا، جس کے مقابلے میں فاضل مقالہ نگار کو "حالی کے یہاں ایک قسم کا پھیکاپن یا بے نمکینی" محسوس ہوئی، ایک بند نمونے کے طور پر نقل کیا جاتا ہی ؎

بھر دیے پانی نے جل تھل ندیاں بہنے لگیں — چھوڑکر شانوں پہ زلفیں مُسکرائے نازنیں
آج ہی غرقِ سفیدی سُرخ تھی کل جو زمیں — سرد پانی چوس کر ذرّوں نے آنکھیں بند کیں
جھوم کر برسی ہی کیا برسات کی پہلی گھٹا

پریم چند
از مدن گوپال - ناشر: دی بک ابوڈ، سرکلر روڈ، لاہور - قیمت: تین روپے آٹھ آنے -

مدن گوپال صاحب نے اردو کے مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس منشی پریم چند پر یہ مختصر سی کتاب انگریزی زبان میں لکھی ہے - جو چھوٹے سائز کے ایک سو تیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے -

اس کتاب میں انھوں نے سب سے پہلے پریم چند کے حالاتِ زندگی بیان کیے ہیں - اور اس کے تمام نشیب و فراز کو آنکھوں کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے - اس کے بعد انھوں نے پریم چند کے ماحول پر روشنی ڈالی ہے اور جن سماجی حالات سے وہ متاثر ہوئے ہیں، ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے پریم چند کی شخصیت اور ان کے فن کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے - اور آخر میں انھوں نے ان کی ناول نویسی اور افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے - جس سے پتا چلتا ہے کہ مدن گوپال صاحب نے منشی پریم چند کا مطالعہ کرنے میں بڑی محنت کی ہے - چناں چہ ان کے آرٹ اور زندگی، دونوں کے اسرار و رموز ان پر پوری طرح کھل گئے ہیں -

ناولوں پر جہاں انھوں نے تنقیدی نظر ڈالی ہے، اس میں ایک بات البتہ کھٹکتی ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے پریم چند کے فن کا مقابلہ ڈکنس، ٹالسٹائے، گورکی، ہارڈی اور ہکسلے وغیرہ سے کیا ہے - جو ایسا کچھ زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوا - زیادہ اچھی بات تو یہ ہوتی کہ مدن گوپال صاحب اس کی بجائے ان ناول نگاروں کے اثرات کا تذکرہ کرتے، جو پریم چند نے شعوری یا غیر شعوری طور پر قبول کیے -

بہرحال یہ کتاب پڑھنے کے قابل ہے اور چوں کہ وہ ہندستان کے ایک بڑے ادیب کو انگریزی دانوں سے روشناس کرتی ہے، اس لیے اس کا وجود کچھ اور بھی زیادہ اہمیت کا مالک ہو جاتا ہے -　　(ع - ی)

ادب اور زندگی
از مجنوں گورکھ پوری - ناشر: کتاب خانۂ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ - قیمت دو روپے

اردو کے مشہور افسانہ نگار اور نقاد جناب مجنوں گورکھ پوری کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس کو کتاب خانۂ دانش محل لکھنؤ نے شائع کیا ہے - اور اگرچہ یہ دوسرا ایڈیشن ہے لیکن بعض حیثیتوں سے پہلے ایڈیشن سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے - کیوں کہ اول تو اس میں کئی نئے مضامین کا اضافہ ہے اور دوسرے اس کو کارکنانِ دانش محل نے چوں کہ نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے اس لیے اس کی صوری حیثیت بھی پہلے ایڈیشن سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے - "ادب اور زندگی" کے اس ایڈیشن میں جو مضامین بڑھائے گئے ہیں ان میں

"نیا ادب کیا ہے"، "اُردو مختصر افسانے میں جدید میلانات" اور "نظیر اکبرآبادی" (ضمیمہ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

"نیا ادب کیا ہے؟" ——— ہمارے نئے ادبی رجحانات، ان کی اہمیت اور ضرورت پر ایک مختصر مگر نہایت ہی مدلّل، جامع اور سیر حاصل تبصرہ ہے۔ اس مضمون میں مجنوں صاحب نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ہمارے جدید ادب میں ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی کا جھگڑا دو ایسے طبقوں اور جماعتوں کا جھگڑا ہے، جو زندگی کو دو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور زندگی کے متعلق جن کا نقطۂ نظر ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہے۔ ان میں سے ایک زندگی کو جامد اور غیر متحرک سمجھتا ہے اور اگر ایسا نہیں سمجھتا تو اس کو جامد اور غیر متحرک بنانے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ دوسرے کا خیال ہے کہ زندگی ہر دم جوان اور پیہم رواں دواں ہے جس کی وجہ سے اس کے ہر شعبے میں تغیر کی حکم رانی ازبس ضروری ہے چناں چہ زندگی کی کروٹوں کے ساتھ ساتھ ادب بھی کروٹیں بدل رہا ہے۔ اور ترقی پسندی بھی اسی طرح کی ایک کروٹ ہے۔ ہر دور کا ادب اپنے اپنے وقت کی سماجی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ چناں چہ آج کے ادب کا بھی یہی حال ہے کہ اس کے دامن میں وقت کے نہایت ہی اہم سماجی مسائل آگئے ہیں۔ سرمایہ و محنت کی کش مکش، ایک نئی دنیا کا قیام، طبقاتی تقسیم اور اس کی بے اعتدالیاں، تمدنی اور سماجی نظام میں انقلاب کی ضرورت، دولت کی مساوی تقسیم، جنسی ناہمواری ——— یہ اور اسی طرح کے اور مسائل ترقی پسند ادب کے خاص موضوعات ہیں۔ کیوں کہ آج خود انسانیت ان کی طرف زیادہ توجہ کر رہی ہے۔ وہ ان کو جلد سے جلد حل کرنا چاہتی ہے تاکہ زندگی کو پھلنے پھولنے کا موقع مل سکے۔ اور وہ سکون و مسرت اور امن و شانتی سے ہم کنار ہو ——— لیکن مجنوں صاحب سارے نئے ادب کو ترقی پسند ادب خیال نہیں کرتے۔ ان کو اس کا ایک حصہ ناقص بھی نظر آتا ہے جس میں آیندہ تعمیر کا کوئی جز نہیں۔ ان کے خیال میں "ترقی پسند ادب کے لیے ضروری ہے کہ وہ سنجیدہ و قیع، امید افزا اور حوصلہ انگیز ہو۔ اس میں اگر تصوف اور تجرد کی گنجایش نہیں تو کلبیت Cynicisam اور چڑچڑاہٹ کا بھی گزر نہیں ہے۔ انقلابیت یا اشتراکیت کا تخیئلی معیار یہ ہے کہ کام کرنے والے میں ایک دھن ہو اور اس کے ماتھے پر شکن نہ ہو۔ اس کے اندر تھوڑی سی سخت دلی کی ضرورت ہے ورنہ اس کی انقلابیت جذباتی انقلابیت ہو کر رہ جائے گی جو ایک قسم کی خلوبیت Defeatsam ہے" ——— غرض یہ کہ وہ ترقی پسند ادب کی کمزوریوں کو کمزوریاں اور خامیوں کو خامیاں کہنے سے ہچکچاتے نہیں بلکہ وہ ترقی پسندی کے تخریبی رجحانات کو ختم کرنا بھی

اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا کہ وہ تعمیری رجحانات کے وجود کو ضروری جانتے ہیں۔ ان کو ترقی پسند ادب کے ماضی سے کنارہ کشی بھی منظور نہیں برخلاف اس کے ان کی نظر میں ماضی کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کے افعال میں ماضی سے قطع تعلق کرکے کوئی بڑا ادبی کارنامہ پیش کیا ہی نہیں جاسکتا کیوں کہ جدید ادب کی جڑیں بہرحال ماضی ہی میں پیوست ہوتی ہیں جن کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرنا گویا اس کی فطری نشو ونما کا گلا گھونٹ دینا ہے۔ وہ ترقی پسند ادیبوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ "ماضی یک قلم حرفِ غلط ہے اور اسلاف کے اکتسابات ہمارے کسی کام کے نہیں۔ دھوکا ہے۔ روایات یعنی ماضی کے اکتسابات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہم کو انھی کو لے کر آگے بڑھنا ہے ورنہ تاریخی تسلسل باقی نہیں رہے گا۔" ان کے نزدیک روایات نہایت زبردست سماجی قوتیں ہیں مگر وہ جامد اور غیر متحرک ہیں۔ جس میں وہ حرکت پیدا کرکے ان کو انقلاب اور ترقی کی قوتوں میں تبدیل کردینا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ وہ رجعت اور انحطاط کے اسباب نہ بن جائیں ـــــ غرض یہ کہ نئے ادب اور ترقی پسند ادب پر ان کے خیالات نہایت ہی سلجھے ہوئے ہیں۔ جن کو پیش کرکے انھوں نے ترقی پسند ادب کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو دور کردی ہے۔

مجنوں صاحب نے "اردو مختصر افسانے میں جدید میلانات" پر جو مضمون لکھا ہے۔ وہ بھی اگرچہ مختصر ہے لیکن جامعیت رکھتا ہے۔ چوں کہ یہ کئی سال ادھر لکھا گیا ہے اس لیے اس میں ان رجحانات اور میلانات کا ذکر موجود نہیں ہے۔ جو پچھلے دو تین سال میں افسانہ نگاری میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور نہ اُن افسانہ نگاروں ہی کا تذکرہ ہے جن کا فن اسی عرصے میں پروان چڑھا ہے۔ مثلاً اس مضمون میں کرشن چندر، فیاض محمود، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی اور ان بے شمار بالکل نوجوان لکھنے والوں کا ذرا بھی ذکر نہیں ہے جو بہت ہی تھوڑے عرصے میں ہمارے افسانوی ادب پر چھاگئے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مجنوں صاحب نے یہ مضمون اس وقت لکھا ہے جب ان سب کے فنوں میں کوئی خاص سنبھلی ہوئی کیفیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے شاید انھوں نے ان کا تذکرہ مناسب نہیں سمجھا۔ بہرحال جو کچھ انھوں نے اردو افسانوں کے جدید میلانات پر لکھا ہے وہ گہری سوچ کا نتیجہ ہے۔

ان کے علاوہ اس مجموعے میں جو دوسرے مضامین شامل ہیں وہ بھی کسی کم اہمیت کے مالک نہیں "ادب

اور زندگی"، "مبادیاتِ تنقید"، "زندگی اور ادب کا بحرانی دور"، "ادب اور ترقی"، "ہندستانی ناٹک"، "نظیر اکبر آبادی" اور "حالی کا مرتبہ اُردو ادب میں" ـــــ یہ سب کے سب نہ صرف اپنے موضوعات کے اعتبار سے اہم ہیں بلکہ اپنے اندر سوچ کی وہی بلندی اور تفکر کی گہرائی رکھتے ہیں۔

"ادب اور زندگی"، "مبادیاتِ تنقید"، "زندگی اور ادب کا بحرانی دور"، "ادب اور ترقی" ـــــ ان چاروں مضامین میں کچھ ایسی ادبی باتیں سموئی ہوئی ہیں، کچھ ایسے ادبی مباحث کا تذکرہ ہے، کچھ ایسے ادبی مسائل کا بیان ہے، جن پر مختلف ممالک میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اُردو ادب جن سے بہت بڑی حد تک آج بھی تہی دامن ہے ـــ وہ ادبی باتیں اور ادبی مسائل یہ ہیں کہ ادب کیا ہے؟ ادب کے عناصر کیا ہیں؟ ادب کے لیے کیا چیزیں ضروری ہیں؟ ادب کا زندگی سے کیا تعلق ہے؟ ـــــ اور آیا کوئی تعلق ہے بھی یا نہیں؟ ادب کی سماجی اہمیت کیا ہے؟ ادب انسانیت کے لیے کیوں ضروری ہے؟ ادب کا مقصد کیا ہے؟ کس زمانے میں کیسا ادب پیدا ہونا چاہیے؟ ادب کا کوئی افادی پہلو ہے بھی یا نہیں؟ ادب اور جمالیات سے کیا رشتہ ہے؟ ادب میں حُسن کاری کی کیا اہمیت ہے؟ اور وہ کس حد تک ضروری ہے؟ ادب میں مواد اور ہیئت موضوع اور اسلوب کس چیز کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے؟ ـــــ غرض یہ کہ کچھ اسی طرح کے موضوعات ہیں جن پر مجنوں صاحب نے نہایت کامیابی کے ساتھ قلم اُٹھایا ہے۔ اور جس نے بڑی حد تک اُردو تنقید کے نظریاتی پہلو کو مضبوط بنانے میں مدد کی ہے۔ (ع ۔ ی)

معاشیات

مطبوعات

ادارۂ معاشیات حیدر آباد دکن

خوشی کی بات ہے کہ جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے اساتذہ وطلبہ نے مختلف ادارے علمی اور اصولی مباحث پر کتابیں شائع کرنے کے لیے قائم کیے ہیں جن میں ایک ادارۂ معاشیات بھی ہے جو اس وقت تک مختلف اقتصادی مسائل پر بہت رسائل شائع کرچکا ہے اور ان میں سے بعض پر "اُردو" کی سابقہ اشاعتوں میں تبصرہ بھی کیا جاچکا ہے۔ ادارے کے نگراں بلکہ روحِ رواں ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی کا نام کسی مزید تعریف و توصیف

ان رسالوں کی عام خصوصیت یہ ہو کہ معاشیات کے ضروری اہم مسائل جن کا روزمرّہ کی زندگی سے تعلق ہو انھی پر بحث کی گئی ہو اور ہر بحث پر ایک الگ رسالہ لکھا گیا ہو جو کم و بیش اسّی صفحات کی مختصر ضخامت میں ہو اور اسی میں تمام کام کی باتیں بیان کردی گئی ہیں۔ ہر مضمون پر مختلف لکھنے والوں نے لکھا ہو اور اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہو کہ اندازِ بیان ایسا رہے کہ معمولی درجے کے اُردو خواں کی سمجھ میں آجائے اور اس طرح عامی اور عالم دونوں کے لیے یکساں مفید ہو۔ حال ہی میں اس ادارے نے جو رسائل ہمیں برائے تبصرہ بھیجے ہیں ان کا حال مختصراً درج ذیل کیا جاتا ہو۔ یہ رسائل ادارۂ معاشیات فاطمہ منزل حمایت نگر حیدرآباد دکن سے مندرجۂ ذیل قیمتوں پر حاصل کیے جا سکتے ہیں:۔

«معاشی لائحۂ عمل»، حصّہ دوم، مترجمہ سعید احمد مینائی بی اے (عثمانیہ) حجم ۵۸ صفحے قیمت بارہ آنے۔

یہ مشہور و معروف «بمبئی پلان» کے ترجمے کا دوسرا حصّہ ہو۔ پہلے حصّے پر اس کے پیش تر تبصرہ کیا جاچکا ہو۔ اس دوسرے حصّے میں تقسیمِ دولت اور حکومت کے فرائض سے بحث کی گئی ہو۔ چوں کہ تعمیرِ بعد از جنگ کے مسائل اس وقت زیرِ بحث ہیں، جس میں بمبئی پلان کو خاص اہمیت حاصل ہو خصوصاً اس لیے بھی کہ اس کے مصنّفین میں سے ایک صاحب یعنی سر اردیشر دلال اس وقت حکومتِ ہند کے ممبر ہیں جن کے سپرد اسی قسم کا کام کیا گیا ہو۔ اس لیے اُردو داں پبلک کو اس پلان کی تفصیلات سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہو اور امید ہو کہ رسالۂ زیرِ نظر کے ہر دو حصّے دل چسپی سے پڑھے جائیں گے۔

«زرعی پیداوار کی فروخت»۔ از محمد تاج الدین بی اے (عثمانیہ) و مانک بھٹ صاحب عثمانیہ۔ حجم ۸۰ صفحات قیمت عہ

اس رسالے میں اہم زرعی پیداوار اور ان کی فروخت کا موجودہ طریقہ، اس طریقے کے نقائص اور جدید منظم طریقے کی تجاویز پیش کی گئی اور اس کی اصلاح میں حکومت جو کارروائیاں کرسکتی ہو وہ بتائی گئی ہیں۔ حکومت نے کچھ دنوں سے مارکٹنگ کا محکمہ قائم کیا ہو مگر ابھی اس میں اتنی وسعت نہیں ہوئی ہو کہ زرعی پیداوار کی فروخت پر قابو حاصل کرسکے اور حریص بنیوں اور آڑھتیوں سے جنس پیدا کرنے والوں کو جو تکلیفیں اور نقصانات پہنچتے ہیں ان کا تقاضا یہ ہو کہ اس مسئلے پر جلد تر توجہ کی جائے۔ ہندستان ایک زرعی ملک ہو اور یہاں اگر زرعی

پیداوار کی فروخت کا انتظام بھی معقول نہ ہوا تو ملک کی اقتصادی حالت کس طرح درست ہوسکتی ہے۔ رسالۂ زیرِ نظر میں اسی مسئلے سے بحث کی گئی ہے۔

"نظری اور عملی معاشیات" از محمد ناصر علی ایم اے (عثمانیہ) حجم ۸۲ صفحات قیمت عہ

اس رسالے میں عام معاشیات اور خصوصاً ہندستانی معاشیات کے بعض مسائل پر اصولی اور عملی حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔ خاص کر ہندستان کے اضافۂ آبادی سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل بتایا گیا ہے اور ہندستان کی قدیم صنعتیں اور ان کے زوال کے اسباب سے بحث کی ہے۔ اندازِ بیان ادارۂ سیاسیات کے عام معیار کے مطابق عام فہم ہے اور مصطلحات سے حتی الامکان پہلو بچاکر لکھا گیا ہے جس سے عام لوگوں کی معلومات میں بھی اضافہ ہوگا۔

"ہندستان کا مالی نظام"۔ از خواجہ شمس الدین بی اے (عثمانیہ) حجم ۸۰ صفحات قیمت عہ۔

اس رسالے میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ہندستان کے نظامِ مالیہ سے بحث کی گئی ہے اور انتظامی ادارے میں مالیات کی اہمیت بتاکر ہندستانی مالیات کی تاریخ اور اہم محاصل کی تاریخ بیان کی گئی ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ اس کے بعد ۱۹۱۶ء اور ۱۹۳۵ء کی آئینی اصلاحات اور ان کا ہندستانی ملیے پر اثر دکھایا گیا اور پھر ہندستانی مالیے پر جنگ کے اثرات واضح کرکے عام مالی پالیسی پر بحث و تنقید کی گئی ہے۔ اس طرح ہندستانی مالیے کا مسئلہ عام فہم زبان میں پورے طور پر سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، جو امید ہے کہ مقبول ہوگی۔

"ہندستان کے زرعی مسائل"۔ از شفیق الرحمان بی اے (عثمانیہ) حجم ۸۰ صفحات قیمت عہ

ہندستان ایک زرعی ملک ہے اور صنعت و حرفت کی یہاں کتنی ہی ترقی ہوجائے اس ملک کی یہ خصوصیت باقی رہے گی اس لیے زراعت کا مسئلہ ہندستان کے لیے تمام اقتصادی مسائل میں سب سے زیادہ اہم ہے اور اس رسالے میں اس مسئلے سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ زمین کی زرخیزی، کھاد کا استعمال، ذرائع آب پاشی، تقسیم و انتشارِ اراضی، زرعی آلات، مواشی غرض کہ تمام متعلقہ زرعی مسائل کی وضاحت کرکے زرعی ترقی کے مستقبل پر ماہرانہ بحث کی گئی اور عملی اصلاحی تدابیر بتائی گئی ہیں جو حکومت اور قومی کارکنوں دونوں کے لیے مفید ہوں گی۔

'ہندستان کے صنعتی مسائل'۔ از سعید احمد مینائی، بی اے (عثمانیہ)، حجم ۸۶ صفحات قیمت عہ۔
ہندستان کی صنعتی رفتار کو حکومت کی غیر جانب دارانہ بلکہ غیر ہمدردانہ پالیسی سے جو نقصان پہنچا ہے وہ اس رسالے میں واقعات و اعداد و شمار سے واضح کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ کس طرح یہاں کی اکثر عمدہ صنعتیں اس پالیسی کی وجہ سے فنا ہوگئیں۔ اور پھر ان کے دوبارہ زندہ کرنے کی تدابیر بھی بتائی گئی ہیں۔ قدیم صنعتوں کے فنا ہوجانے کی وجہ سے یہاں کے صنعتی کاروبار کو پھر سے اُبھارنے کی ضرورت ہے جو بغیر تامین (پروٹیکشن) کے ممکن نہیں ہے لیکن تامین کے سلسلے میں بھی حکومت نے جو قدم اٹھایا ہے وہ بہت ہی ناکافی اور غیر تشفی بخش ہے۔ گھریلو صنعتیں جو ہندستان میں خاص اہمیت رکھتی ہیں؛ حکومت کی توجہ کی محتاج ہیں اور اس بات کی ضرورت ہے کہ انھیں ماہرانہ مشورے اور بازار کے بدلتے ہوئے حالات سے آگاہ کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ ہندستانی حرفتوں کے مالی پہلو سے بھی بحث کی گئی ہے اور موجودہ صورتِ حال کو بہتر بنانے کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔

'ہندستان کی تجارت'۔ از محمد معین الدین بلگامی، بی اے (عثمانیہ) حجم ۸۴ صفحات، قیمت عہ
اس رسالے میں معاشیات کی اُس اہم شاخ سے بحث کی گئی ہے جو مُلکی تجارت سے متعلق ہے۔ اس میں ہندستان کی اندرونی اور بیرونی تجارت کے مسائل سے تاریخی پس منظر کے پیشِ نظر بحث کی گئی ہے اور تنزّل کے اسباب بتاکر اصلاح کی تجاویز بتائی گئی ہیں۔ ہندستان کی تجارت پر جنگ کے اثرات بھی اعداد و شمار سے واضح کیے گئے ہیں اور آیندہ تجارتی ترقّی کے لیے جن وسائل کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے اُن کی مدلّل تشریح کی گئی ہے۔ توازنِ تجارت اور توازنِ ادائی کے مسائل ذرا اصولی قسم کے ہیں مگر مُلک کی عام فلاح اور اقتصادی حالت پر ان کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے اس لیے ان مسائل پر بھی حتی الامکان عام فہم زبان میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

'ہندستان کی سڑکیں اور ریلیں'۔ از ارجن پرشاد شرما (عثمانیہ) حجم ۸۰ صفحات قیمت عہ۔
ہندستان میں نقل و حمل کا مسئلہ بہت کچھ محتاجِ اصلاح و ترقّی ہے، اور چوں کہ کسی ملک کی اقتصادی حالت کا اندازہ بہت کچھ اسی سے ہوتا ہے اور اس پر دارو مدار ہے اس لیے حکومت اور قومی کارکنوں کو اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا اور ضروری تدابیر اختیار کرنا چاہیے۔ رسالۂ زیرِ نظر میں اس مسئلے کے ایک پہلو یعنی ریلوں

اور سڑکوں سے بحث کی گئی ہو اور ان کی انتظامی خامیوں کو واضح کرکے اصلاح کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ ریلوں کی ہندستان میں کمی کا مظاہرہ موجودہ جنگ میں نہایت ہی افسوس ناک طریقے پر ہوا جب کہ ضروریاتِ سفر میں زیادتی اور انتظاماتِ نقل وحمل کی کمی کی وجہ سے مسافروں کی تکلیفیں انتہا کو پہنچ گئیں اور خاص کر نیچے درجے کے مسافر تو سامانِ باربرداری کی طرح ٹھونس ٹھونس کر ریل کے ڈبوں میں بھرے جانے لگے اور پٹڑوں پر لٹک کر ریل پر چلنے والوں کو اکثر مہلک حادثات پیش آئے۔ اس معاملے میں حالات کو سمجھ کر حکومت پر زور ڈالنے کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہوگی جس میں عام فہم زبان میں مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو سمجھایا گیا ہو۔

"ہندستان میں امدادِ باہمی کی تحریک"۔ از محمد طاہر حامد (عثمانیہ) حجم ۸۷ صفحات قیمت ۸/

اس رسالے میں مختلف ممالک میں امدادِ باہمی کے حالات دکھا کر ہندستان میں اس تحریک کی حالت سے مقابلہ کیا گیا ہو اور موجودہ نظام پر تنقید و تبصرہ کرکے آیندہ کے لیے مفید عملی تجاویز بتائی گئی ہیں۔ ہندستان میں مہاجنی کاروبار کی ترقی کی بڑی وجہ امدادِ باہمی کے اداروں کی کمی ہو، اور مہاجنی ذہنیت جو اخلاقی حیثیت سے بہت ہی پست ہوتی ہو اسی خامی کی پیداوار ہو۔ اس لیے امدادِ باہمی کی تحریک کو ہندستان میں بہت ترقی دینے اور پھیلانے کی ضرورت ہو تاکہ حرفتی کاروبار میں لگانے یا اہم ذاتی اخراجات کے روپے کی ضرورت اسی سے حل ہوسکے اور مہاجنوں سے قرض نہ لینا پڑے جو غریب طبقے کے لیے بہت گراں پڑتا ہو اور اس سے ان کی ساری زندگی پریشانی میں گزرتی ہو۔ زیرِ نظر رسالے میں اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی گئی ہو، جو حکومت اور عوام الناس دونوں کے لیے مفید ہو۔

"زرعی قرض داری"۔ از سید عبداللہ (عثمانیہ) حجم ۸۰ صفحات قیمت ۸/

ہندستانی مزارعین کو سب سے زیادہ پریشانی مہاجنی قرضے کی ہو جس کی وجہ سے اُن کی سخت محنت کی پیداوار پر مہاجن کا قبضہ ہو جاتا ہو اور دیہی مہاجن اتنے حریص ہوتے ہیں کہ وہ مقروض مزارعین کا جونک کی طرح خون چوس لیتے ہیں۔ رسالہ زیرِ نظر میں زرعی قرض داری کا ہولناک نقشہ اعداد و شمار سے کھینچ کر دکھایا گیا ہو اور حکومت نے صورتِ حال کی اصلاح کے لیے جو قوانین وقتاً فوقتاً بنائے ہیں، ان پر بحث کی گئی ہو۔ پھر ایک باب میں خاص مملکتِ حیدرآباد کے حالات کی وضاحت کرکے زرعی قرض داری کو روکنے کی تدابیر بتائی گئی ہیں

جن پر صوبائی حکومتوں کو غور کرنا چاہیے اور قومی اداروں کو اس معاملے میں حکومت کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔

'ہندستان کی قومی آمدنی': از توفیق محمد خاں بی اے (عثمانیہ) حجم ۸۰ صفحات قیمت عہ

کسی ملک کی قومی آمدنی کا بیش تر وہاں کے باشندوں کے معیارِ زندگی سے اندازہ کیا جاتا ہو اور دوسرے ممالک کے مقابلے میں ہندستان کا معیار اس سلسلے میں بہت ہی پست ہو جسے اُبھارنے کے لیے خطیر رقم سرمایہ سے طویل مدت تک کام کرنے کی ضرورت ہو جیسا کہ مشہور 'بمبئی پلان' کے مرتبہ نتائج سے معلوم ہوتا ہو۔ قومی نقطۂ نظر سے یہ مسئلہ نہایت ہی اہم ہو اور اسے پُورے طور پر سمجھنے کے لیے کچھ اصُولی معلومات کی بھی ضرورت ہو۔ رسالہ زیرِ نظر میں اسی مسئلے سے بحث کی گئی ہو اور جہاں تک عام فہم زبان میں ممکن ہوسکا اس کے ہر پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ آخر میں قومی آمدنی میں اضافہ اور باشندوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے کی تدابیر بھی بتائی گئی ہیں اور اس سلسلے میں 'بمبئی پلان' کی تجاویز پر بھی تبصرہ کیا گیا ہو۔

'ہندستان کے مزدوروں کے مسائل': از حامد محی الدین بی اے (عثمانیہ) حجم ۸۰ صفحات قیمت عہ

کسی ملک کی معاشی زندگی میں مزدور کو جو اہمیت حاصل ہو اُس کا صحیح اندازہ وہ لوگ نہیں کرسکتے جو ان کی محنت کی پیداوار کو قلیل قیمت پر لے کر اپنی آسائشوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہو کہ ہندستان کی حکومت جو دفتری قسم کی ہو مزدوروں کے مسائل کو پورے طور پر سمجھنے سے قاصر ہو اور اس دفتری راج میں مزدور کی حالت بہت زیادہ ناگفتہ بہ ہوتی جاتی ہو۔ رسالۂ زیرِ نظر میں اس مسئلے کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہو اور ہندستانی مزدوروں کے مخصوص مسائل کی تشریح کرکے اُن سرکاری قوانین پر تبصرہ کیا گیا ہو جو مزدوروں کی حالت سدھارنے کے لیے وقتاً فوقتاً بنائے گئے اور جن سے کوئی قابلِ لحاظ اصلاح نہیں ہوئی۔ موجودہ جنگ میں ہندستان کے مزدور طبقے کو جس طرح متاثر کیا ہو اس کی بھی تشریح کی گئی ہو اور تنظیم بعد از جنگ میں مزدوروں کا جو حصّہ ہونا چاہیے اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے جس قسم کی تدابیر کی ضرورت ہو ان کی تشریح کی گئی ہو۔

'ہندستان کا نظامِ بنک کاری'۔ از رام اوتار بی اے (عثمانیہ) حجم ۸۰ صفحات قیمت عہ

موجودہ سرمایہ دارانہ نظامِ حکومت میں نظامِ بنک کاری کو بڑی اہمیت حاصل ہو اور جب تک دُنیا میں

سود کا رواج ہو اور قانون اس وسیلۂ آمدنی کو جائز رکھتا ہو اُس وقت تک بنکوں کا قیام ضروری ہو اور ان کے
ذریعے سے مہاجنی کاروبار کو بڑی حد تک گھٹایا اور مزارعین اور اہلِ حرفہ کے بارِ قرض کو بہت کچھ ہلکا کیا جاسکتا
ہو مگر ہندستان کے موجودہ نظامِ بنک کاری کو عوام الناس سے دُور کا بھی واسطہ نہیں رکھا گیا ہو اور بنکوں کا سارا
کاروبار سرمایے داروں سے رہتا ہو۔ اس نظام کی کایا پلٹ تو بہ حالتِ موجودہ دُشوار ہو لیکن اصلاح و ترقی کی جو گنجایش
اس میں ہو وہ بروے کار لائی جاسکتی ہو اور اس کے لیے ضرورت اس کی ہو کہ خود اس نظام کی تفصیلات کو سمجھا
جائے۔ زیرِ نظر رسالے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہو اور اس کی اصلاح کی تدابیر بھی بتائی گئی ہیں۔ اسی
کے ساتھ مبادلے اور تجارتی لین دین کی موجودہ شکل کو مُلکی مفاد کے لحاظ سے بدلنے کی بھی ضرورت بتائی گئی ہو
اور یہ کوشش کی گئی ہو کہ تمام متعلقہ مسائل عوام الناس کی سمجھ میں آجائیں۔

"ہندستان کا معاشرتی نظام" از حسن الدین احمد بی اے (عثمانیہ)، حجم ۸۷ صفحات قیمت ۸ آنے۔

عام ملک کی اقتصادی حالت پر وہاں کے نظامِ معاشرت کا بہت بڑا اثر پڑتا ہو اور رہن سہن لباس غذا
مکان پانی وغیرہ کی خرابیوں کی وجہ سے نہ صرف صحت متاثر ہوتی ہو بلکہ اقتصادی حالت میں بھی تنزل ہوتا ہو۔
بہت سی شادی بیاہ وغیرہ کی رسمیں اور برادری کے رواج اسراف کا باعث ہوتے ہیں جس میں لوگ مقروض ہوجاتے
ہیں اور یہ قرض محدود آمدنی میں ادا نہیں ہو پاتا جس سے ساری عمر پریشانی میں گزرتی ہو اور تمام صلاحیت کار مردہ
ہو جاتی ہو۔ اس لیے اقتصادی مسائل کے اس شعبے سے عوام کو آگاہ کرنے کی ضرورت ہو اور رسالۂ زیرِ نظر میں
کوشش کی گئی ہو کہ ہندستان کے موجودہ معاشرتی نظام کی خرابیوں کو واضح کرکے ان کی اصلاح کی تدابیر
بتائی جائیں اور اس سلسلے میں حکومت اور عوام الناس کا جو فرض ہو اُس پر توجہ دلائی جائے۔ موجودہ جنگ کا جو
اثر ہندستانی معاشرت پر پڑا ہو اور جنگ کے بعد جو مسائل اس سلسلے میں پیدا ہوں گے ان کی بھی تشریح کی
گئی ہو اور بعد از جنگ کی بے روزگاری اور تجارتی کسادبازاری کو قابو میں رکھنے کی ضرورت واضح کی گئی ہو خاص کر
حکومت کو اس بارے میں جو تدابیر اختیار کرنی چاہییں وہ بتائی گئی ہیں۔ (ر۔ ع۔ ہ)

رسائل کے خاص نمبر اور سال نامے

مجلّہ (انجمنِ اساتذہ صوبۂ اورنگ آباد دکن کا سہ ماہی رسالہ)

یہ سہ ماہی رسالہ صوبۂ اورنگ آباد دکن کے اساتذہ نے مولوی سیّد ساجد علی صاحب صدرِ مہتمم تعلیمات صوبۂ اورنگ آباد کی سرپرستی میں جاری کیا ہے۔ اس کا مقصد تعلیم و تربیت ہے۔ جو مضامین اس پہلے نمبر میں جمع کیے گئے ہیں وہ مقصد کے اعتبار سے اُستادوں کے لیے بہت مفید ہیں اور ان سے اُن کے علم اور معلومات میں کافی اضافہ ہوگا اور انھیں اپنے تجربوں میں بہت مدد ملے گی۔ اُستاد کے فرائض بہت اہم ہیں اور یہ اسی حالت میں بخوبی انجام دے سکتے ہیں جب کہ ان کی معلومات میں برابر اضافہ ہوتا رہے۔ اس رسالے کے ذریعے اساتذہ اپنے اپنے تجربے دوسروں تک پہنچا سکتے اور تعلیم و تربیت میں آسانیاں بہم پہنچا سکتے ہیں۔

سال نامۂ "آج کل" یہ رسالہ جنگ کی پیداوار ہے۔ جنگ کے متعلق تو اس میں دو چار صفحے ہی ہوتے ہیں، باقی سارا رسالہ دل چسپ ادبی مضامین اور فسانوں اور شعر و شاعری کے لیے وقف ہوتا ہے اور اس وجہ سے اسے بہت مقبولیت حاصل ہوگئی۔ یہ سال نامہ ۱۵۲ صفحات پر ہے۔ اس میں بعض بہت اچھے مضمون پڑھنے اور مطالعے کے قابل ہیں۔ مضامین کی نوعیت بھی گوناگوں ہے۔ تاریخی، تنقیدی، علمی، معاشیاتی کے علاوہ دو ڈرامے، پندرہ افسانے اور کوئی اکتیس نظمیں اور غزلیں ہیں اور سولہ تصویریں۔ اس رسالے کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کے قابل اڈیٹر نے اُردو کے اچھے لکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ یہ سال نامہ اس کا شاہد ہے۔ اس میں ہر ذوق کے لیے دل چسپی اور غور و فکر کا سامان موجود ہے۔ ہم اس کے اڈیٹروں کو اس کام یابی پر مبارک باد دیتے ہیں۔

"شاہ کار" یہ شاہ کار کا "ترقی پسند ادب" نمبر ہے۔ اس میں آپ کو ترقی پسند ادب اور اس کے کارناموں کے جانچنے کا بہت اچھا موقع ملے گا۔ اس میں نثر بھی ہے اور نظم بھی۔ ادب بھی اور اس کی تنقید بھی۔ خوبیاں بھی اور خامیاں بھی۔ لکھنے والے زیادہ تر ترقی پسند ہیں اور ایک دوسرے کو سراہتے ہیں، یہ قابلِ تعریف بات ہے۔ منظومات میں بے قافیہ اور قافیے دار دونوں طرح کی نظمیں ہیں۔ فسانے مختلف رنگ کے ہیں، بعض ترجمے ہیں بعض طبع زاد، لیکن سب میں جدت اور ترقی پسندی کی جھلک پائی جاتی ہے۔

سال نامۂ "عالم گیر" اس میں زیادہ تر شعر و شاعری اور فسانے ہیں۔ ادبی مضمون صرف تین ہیں۔ ایک معمولی تنقیدی دوسرا ترقی پسند ادب کی تائید میں، تیسرا "روایات اور جدید تخیل شعر"

ہر۔ نظموں میں ترقی پسند شاعر نہیں ہیں۔ فسانوں کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔

نئی زندگی اس رسالے نے اگست ۱۹۴۵ء میں فرانسسکو نمبر شائع کیا ہے، اس نمبر میں مختلف لکھنے والوں نے اس کانفرنس کے مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ اسے چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں بین الاقوامی تنظیم اور جمعیت الاقوام کی تاریخ و واقعات۔ دوسرے باب میں ڈمبرٹن اوکس کے منصوبے اور اُن کی تجویزوں اور بین الاقوامی مجلسِ امن کی تنقید ہے۔ تیسرے باب میں کانفرنس کے فیصلے اور چوتھے میں نیا نظامِ عالم اور ہندستان اور آخر میں اخبارات کی رائیں ہیں۔

اڈیٹر نے ٹھیک لکھا ہے کہ "سان فرانسسکو کانفرنس میں جو سب سے بڑی کمی نظر آتی ہے وہ باہمی اخلاص کی کمی ہے"۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اور کون سی ایسی جمعیت ہے جس میں یہ کمی نہیں۔

مجموعہ مقالاتِ علمیہ حیدرآباد اکادمی کا ساتواں رسالہ ہے جو "اردو" کی تقطیع اور گنجان خط کے ۳۴۴ صفحات پر اکادمی کی مجلسِ ادارت نے شائع کیا ہے۔ مجلس کے ارکان، اور اس مجموعے کی قیمت وغیرہ کی تفصیل رسالے میں تحریر نہیں ہے۔ مجموعہ پانچ مضامین پر مشتمل ہے:- (۱) "حقائقِ حیاتِ انسانی" جس میں سابق پرنسپل کلیۂ عثمانیہ مولوی عبدالرحمان خاں صاحب نے انسان کے دنیا میں ظہور کرنے کے وقت سے موجودہ زمانے تک کے حقائق پر ایک تبصرہ کیا ہے۔ ابتدائی حصے میں سائنس کے دقیق مسائل و قیاسات کی بحث کی ہے تو آخر میں گھریلو زندگی اور اجتماعی اور انفرادی اخلاق کے مباحث بھی زیرِ نظر آگئے ہیں۔ (۲) مولوی عبدالقادر صاحب نے "ادارۂ جنگ کی معاشی توجیہ" کے عنوان سے جنگ کے تجارتی اور مالی اسباب کے بعض جدید نظریات پر نظر ڈالی ہے۔ "ادارہ" غالباً انسٹی ٹیوشن کا ترجمہ ہے لیکن اس موقع پر دستور یا آئینِ جنگ ہمارے محاورے کے مطابق ہوتا۔ "ادارہ" ایک جماعتی نظام کو کہتے ہیں جو کسی خاص مقصد کے لیے قائم اور عمل میں مصروف ہو۔ ایک مقالے میں ڈاکٹر کلیم اللہ صاحب قادری نے کوئی تین جُز کے اندر "فارسی شاعری کا آغاز اور اس کی تاریخ" سمیٹ لینے کی کوشش کی ہے۔ اس پامال مضمون کے لکھنے میں متداول تذکروں کے علاوہ "تاریخِ سیستان" سے بھی مدد لی گئی ہے۔ یہ تاریخ قرنِ سابع میں تالیف ہوئی لیکن صدیوں سے گُم نام رہی اور حال میں منظرِ عام پر آئی ہے۔ اس میں بعض حالات و قیاسات نئے ہیں اگرچہ ضرور نہیں کہ دوسرے اقوال کے مقابلے میں انھیں زیادہ صحیح مانا جائے۔ ڈاکٹر میر ولی الدین

صاحب نے اپنے خاص انداز میں اقبالؔ کے نظریۂ عقل و عشق پر بہت دل چسپ بحث لکھی ہو۔ آخری مقالے میں مولوی یوسف الدین صاحب نے تعلیمی تنظیم بعد از جنگ کے مسئلے پر قلم اُٹھایا ہو۔ اور سارجنٹ صاحب کی تجاویز پر اجمالی نظر ڈالی ہو۔ حال آں کہ مفید عام ہونے کے اعتبار سے یہ مضمون زیادہ سلاست و وضاحت چاہتا تھا۔ بہرحال خوشی کی بات ہو کہ حیدرآباد اکادمی عالمانہ قسم کے مضامین چھاپنے میں کوشاں ہو اور زبانِ اُردو کی قابلِ قدر خدمت انجام دے رہی ہو۔

اعلان

ہندستانی اکادمی یو۔پی الہ آباد کی مجلسِ عاملہ نے اُردو کی مطبوعہ کتابوں پر پانسو روپے سالانہ انعام دینے کے متعلق یہ فیصلہ کیا ہو کہ

۱ — ہر سال مندرجۂ ذیل مضمونوں میں سے ایک پر سلسلے وار انعام دیا جایا کرے گا :-

(الف) شعر اور ڈراما — (د) تاریخ اور حیات نگاری

(ب) ناول اور مختصر افسانے — (ہ) فلسفہ

(ج) مضامین (عام اور انتقادی) — (و) نیچرل سائنس

۲ — انعام سنہ ۱۹۴۵ء میں شعر اور ڈرامے کی کتابوں پر دیا جائے گا۔

۳ — شعر اور ڈرامے کی صرف اُن کتابوں پر غور کیا جائے گا جو ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۴۳ء کے بعد شائع کی گئی ہیں۔

پبلک، اہلِ علم حضرات اور طابعین و ناشرین سے درخواست ہو کہ ہندستانی اکادمی کو مندرجۂ بالا تاریخ کے بعد شائع شدہ شعر اور ڈرامے کی کتابوں کے متعلق تفصیلات سے مطلع فرمائیں تاکہ ابتدائی انتخاب کے وقت اُن پر غور کیا جا سکے اور منتخب کتابوں کے متعلق ججوں کی کمیٹی فیصلہ کر سکے۔

رسالۂ "سائنس" کا نیا دور

جنوری سنہ ۱۹۴۱ ع سے رسالۂ "سائنس" بجائے تیسرے مہینے کے ماہانہ شائع ہونا شروع ہوگیا ہے۔ ضخامت تقریباً ۶۴ صفحات۔ سالانہ قیمت پانچ روپے ششماہی دو روپے آٹھ آنے اور نمونے کی قیمت آٹھ آنے۔

اس رسالے کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور دریافتیں ہورہی ہیں یا جو جدید انکشاف وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان سلیس اور عام فہم زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ اب اس رسالے کا انتظام و مقام اشاعت دہلی سے حیدرآباد بدل گیا ہے۔ خریداری وغیرہ کے متعلق جملہ خط و کتابت اور ارسال زر ذیل کے پتے پر ہونا چاہیے:—

معتمد مجلس ادارت رسالۂ "سائنس"

جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن

نوٹ:— رسالۂ سائنس (سہ ماہی) کے پرانے پرچے پہلے نمبر (جنوری سنہ ۱۹۲۸ع) سے نمبر ۵۲ (اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ع) تک دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سے بہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے فی پرچہ (علاوہ محصول ڈاک) طلب فرمائیے۔

Vol. 25 October 1945 No. 4

THE URDU

The Quarterly Journal

OF

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Edited by

ABDUL HAQ

Published by

A.

Delhi.